مقامِ سنّت

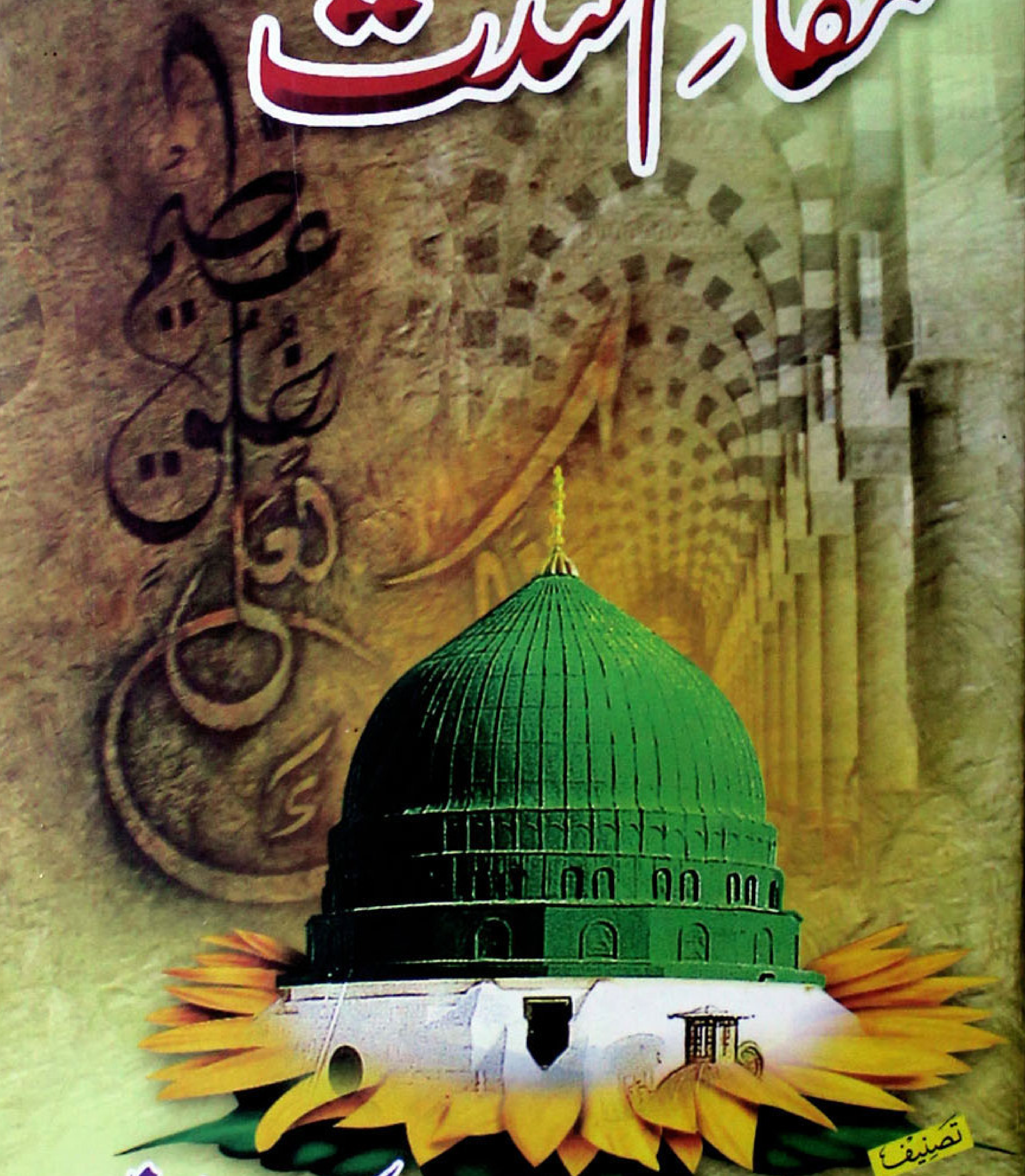

تصنیف

علامہ مشتاق احمد چشتی

شیخ الحدیث جامعہ غوثیہ گولڑہ شریف

فاضل و سابق شیخ الحدیث جامعہ انوار العلوم نیو ملتان

مکتبہ مہریہ کاظمیہ
نزد جامعہ انوار العلوم نیو ملتان

مقامِ سنّت

تصنیف

علامہ مشتاق احمد چشتی

شیخ الحدیث جامعہ غوثیہ گولڑہ شریف
فاضل و سابق شیخ الحدیث جامعہ انوار العلوم نیو ملتان

ناشر
مکتبہ مہریہ کاظمیہ
نزد جامعہ انوار العلوم نیو ملتان

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب .... **مقام سنت**

نام مصنف .... علامہ مشتاق احمد چشتی

پروف ریڈنگ .... مولانا محمد امین سعیدی

تعداد .... ایک ہزار (1000)

صفحات ۲۵۳

سن طباعت .... رمضان المبارک ۱۴۲۸ھ
مطابق اکتوبر ۲۰۰۷ء

قیمت .... =/

ناشر

مکتبہ مہریہ کاظمیہ جامعہ انوار العلوم نیو ملتان
فون: 061-6560699
موبائل: 0304-6123162

انتساب

یہ فقیر پُر تقصیر اپنی اس پہلی تالیف کو آفتابِ رشد وہدایت، بحرِ علم وعرفان، شیخ الکل فی زمانہ ومرجع الکل فی اوانہ سیدی ومولائی ومرشدی حضرت قبلہ عالم شیخ الاسلام پیر سید مہر علی شاہ الحسنی والحسینی الگیلانی نور اللہ مرقدہٗ وَاَفَاضَ اللّٰہُ عَلَیْنَا مِنْ عُلُوْمِہٖ وَبَرَکَاتِہٖ۔

کے نامِ نامی واسمِ گرامی سے منسوب کرتا ہے

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا

کمترین، نیاز مندِ بارگاہِ مہریہ غوثیہ

مشتاق احمد چشتی

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
01	تعارفِ مصنف	07
02	تقریب از علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ	17
03	پیش لفظ	31
04	انکارِ حدیث کے سنگین نتائج	36
05	فتنہء انکارِ سنت کو پھیلانے کے عام حربے	40
06	زیرِ نظر مقالہ	42
07	سنت کا مفہوم	44
08	سنت کے اصطلاحی معانی	46
09	قرآن میں سنت کی اہمیت منصبِ رسالت	56
10	اتباعِ رسول کی دوسری دلیل	62
11	اتباع و اطاعتِ رسول کی تیسری دلیل	64
12	مرکزِ ملت کا غلط تصور	65
13	رسول خدا ﷺ کے آئینی کام پر شبہ کا ازالہ	66
14	اطاعتِ رسول کی چوتھی دلیل	67
15	پانچویں دلیل	67
16	چھٹی و ساتویں دلیل	68
17	آٹھویں دلیل	69

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
18	نویں دلیل	70
19	دسویں دلیل	71
20	عبادات ومعاملات کی تفریق	73
21	حدیث وسنت کی تفریق	75
22	سنت اور تشریح قرآن	75
23	ایک شبہ کا ازالہ	78
24	جامعیت قرآن کا صحیح مفہوم	79
25	فہم قرآن میں صحابہ کی الجھنوں کا حضور ﷺ کی طرف سے حل	80
26	قرآن وسنت کا باہمی ربط	84
27	امام اوزاعی کے کلام سے پیدا شدہ اشکال کا جواب	86
28	سنت بحیثیت مأخذ تشریع	88
29	قرآن وحدیث میں سنت کی تشریعی حیثیت کا ذکر	90
30	ایک شبہ کا ازالہ	95
31	تشریعی احکام کی چند مثالیں	98
32	سنت وحی الٰہی ہے	103
33	سنت کے وحی الٰہی ہونے پر دلائل	104
34	لفظ حکمت کا مفہوم	106

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
35	کتاب کے ساتھ حکمت وسنت نازل کرنے کی حکمت	110
36	تعبیر حکمت پر ایک اشکال کا جواب	110
37	وحی کیا ہے؟	113
38	قرآن سے وحی خفی کا ثبوت	117
39	وحی کا عام مفہوم	126
40	حفاظت حدیث پر ایک واضح استدلال	127
41	قرآن وحدیث کی حفاظت میں ایک فرق	130
42	حدیث اور افتراقِ امت	131
43	مقام سنت صاحب ﷺ سنت کی نظر میں	135
44	مذکورہ حدیث پر اعتراض کا جواب	144
45	حدیث مذکور پر بعض معاصرین کی تنقید اور اس کا جواب	151
46	حدیث مذکور کے شواہد	155
47	دورِ فتن میں تمسک بالسنۃ کی خصوصی تاکید	156
48	حدیثِ مذکور کے بارے میں ایک شبہ کا ازالہ	160
49	عہدِ رسالت میں حدودِ مشاورت	162
50	سنتِ رسول ﷺ کا مقام خلفائے راشدین کی نظر میں	169
51	صدیق اکبر ؓ کا پہلا تاریخی خطبہ	169

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
52	صدیق اکبر ؓ کے فیصلوں کا انداز	171
53	حدِّ اطاعتِ خلیفہ	174
54	لشکرِ اسامہ کی روانگی	175
55	جُرمِ عشق	176
56	مانعین زکوٰۃ سے قتال	178
57	حضرت عمر ؓ کا معیارِ انتخاب	184
58	عمر فاروق ؓ اور احادیثِ نبویہ کا احترام	185
59	منکرین سنت کے چند شبہات کا ازالہ	189
60	حَسْبُنَا کتابُ اللہ سے استدلال	190
61	مسئلہ طلاقِ ثلثہ میں فاروقی فیصلے کی اصل صورت	195
62	مؤلفۃ القلوب کا حصہ اور فاروقی طرزِ عمل	197
63	مفتوحہ اراضی کے متعلق فیصلہ فاروقی اور سنتِ رسول ﷺ	199
64	حضرت عثمان غنی ؓ اور اتباعِ سنت	200
65	مولا علی ؓ کا اہل مصر کے نام پیغام	206
66	حضرت علی ؓ اور روایتِ حدیث میں احتیاط	209
67	حضرتِ علی ؓ اور تمسک بالسنۃ	211
68	اقسام سنت اور ان کا شرعی مقام	212

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
69	سنت کی تقسیم	213
70	خبر متواتر	213
71	خبر متواتر کا وجود	214
72	تواتر کی اقسام	215
73	خبر مشہور	219
74	خبر واحد کی تفصیلی بحث	220
75	خبر واحد کا مفہوم	220
76	خبر واحد کے واجب الاتباع ہونے کے شرائط	221
77	خبر واحد کا حکم	224
78	لفظِ ظن کا حکم	225
79	دلائل حجیتِ خبر واحد	230
80	عہد رسالت کے چند واقعات	233
81	خلفائے راشدین اور خبر واحد	236
82	علماء ملت کا اتفاق	237
83	حرفِ اختتام	239
84	مآخذ و مراجع	243

تعارفِ مصنف

ناشر کے قلم سے

"مقام سنت" کے مصنف، یادگارِ اسلاف استاذ العلماء حضرت علامہ الحاج مولانا حافظ مشتاق احمد صاحب چشتی ہیں جو بیک وقت علوم عقلیہ ونقلیہ کے ماہر دانشور، صاحب طرز محقق، ہر دلعزیز مدرس، قادر الکلام مقرر اور دلآویز مصنف ہیں۔ عالمانہ جلال، صوفیانہ جمال اور محققانہ کمال کے مالک ہمارے ممدوح ۱۵ جنوری ۱۹۴۱ء مطابق ۱۶ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ کو بستی بختاور ضلع بھکر کے مشہور علمی وروحانی فقیر خاندان میں حضرت فقیر حافظ غلام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے گھر پیدا ہوئے۔ بلاشبہ آپ ایسے خاندان کے چشم وچراغ اور اب بزرگ ہیں جو نسلوں سے علوم وفنونِ اسلامیہ کا امین چلا آرہا ہے۔ اس خاندان کی عظمت کا ایک مخصوص حوالہ یہ ہے کہ اس میں اکثر حافظ قرآن گزرے ہیں خصوصاً آپ کے آباؤ اجداد نہ صرف حافظ قرآن ہوئے بلکہ علم وعرفان کی دولت سے بھی مالا مال رہے۔ حضرت علامہ مشتاق احمد چشتی مدظلہ کی علمی عظمت دیکھئے کہ آپ سمیت آپ کے دونوں بڑے بھائی استاذ الاساتذہ حضرت علامہ مولانا فیض احمد اور حضرت علامہ مولانا سید احمد رحمۃ اللہ علیہما متبحر علماء شیوخِ حدیث اور مفتی ہوئے۔

تعلیم وتربیت

آپ نے فارسی نظم کی صورت میں ابتدائی تعلیم ۷ سال کی عمر میں اپنے گھر پر بستی بختاور میں والد ماجد حضرت فقیر حافظ غلام محمد صاحب علیہ الرحمۃ کی زیر نگرانی

شروع فرمائی۔ حفظ القرآن کے علاوہ میٹرک، ایف اے، فاضل فارسی، درس نظامی اور تخصص فی الحدیث والتفسیر (ایم اے) کی تکمیل کی۔

تعلیمی سفر

آپ پہلے بستی بختاور پھر مدرسہ محمودیہ پپلاں ضلع میانوالی، جامعہ غوثیہ آستانہ عالیہ گولڑہ شریف ضلع اسلام آباد، جامعہ اسلامیہ عربیہ انوارالعلوم ملتان اور جامعہ اسلامیہ بہاول پور میں مختلف اوقات میں زیر تعلیم رہے اور ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء کو دورہ حدیث کے بعد سند فراغت سے سرفراز ہوئے۔

فخر روزگار اساتذۂ کرام

آپ کے قابل فخر اساتذۂ کرام میں دونوں بزرگ برادران استاذ الاساتذہ حضرت علامہ مولانا فیض احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ (مؤلف مہر منیر و سابق مفتی درگاہِ عالیہ گولڑہ شریف) حضرت استاذ العلماء علامہ مولانا سید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ (سابق صدر المدرسین و مفتی مدرسہ محمودیہ پپلاں ضلع میانوالی) اور غزالی زماں رازی دوراں امام اہل سنت حضرت علامہ سید احمد سعید شاہ صاحب کاظمی رحمۃ اللہ علیہ (بانی و شیخ الحدیث جامعہ انوارالعلوم ملتان) شامل ہیں۔

جامعہ اسلامیہ بہاول پور میں بطور ریسرچ سکالر

غزالی زماں حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ جب جامعہ اسلامیہ بہاول پور میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے تو حضرت علامہ مولانا مشتاق احمد چشتی مدظلہ نے تخصص فی الحدیث والتفسیر (ایم، اے) میں داخلہ لیا اور دو سال کے عرصے میں تخصص کا امتحان پاس کیا اور یونیورسٹی میں اول آئے

تو مختلف مکاتب فکر کے اساتذہ اور خصوصاً وائس چانسلر ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی آپ کی علمی صلاحیت اور فکری استعداد کے معترف اور اخلاق سے بہت متاثر تھے چنانچہ ان سب حضرات کی رائے سے آپ کو ریسرچ سکالر کے طور پر یونیورسٹی میں بلایا گیا تا کہ آپ علمی و تحقیقی مقالہ لکھیں آپ نے اصولِ تفسیر و تاریخ تفسیر پر نہایت وقیع اور محققانہ مقالہ لکھا جو بزم سعید جامعہ انوار العلوم ملتان کی طرف سے ''علم تفسیر اور مفسرین'' کے نام سے شائع ہو کر اربابِ فکر و دانش سے دادِ تحسین حاصل کر چکا ہے اور اب مزید تفسیری کام کے تازہ جائزے کے ساتھ ''مکتبہ مہریہ کاظمیہ نیو ملتان'' کی طرف سے شائع کیا جانے والا ہے۔

......یہ نور کی بارش کہاں کہاں

استاذ العلماء حضرت علامہ مولانا مشتاق احمد چشتی نے ایک المناک واقعہ (مسعود کھدر پوش کی ایمان واسلام کے خلاف ہرزہ سرائی) کے بعد ریسرچ سکالر کے طور پر جب جامعہ اسلامیہ سے قطع تعلق کر لی تو پھر مختلف مدارسِ اسلامیہ میں علم کے موتی بکھیرے۔ دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف میں ایک سال مدرس، جامعہ غوثیہ گولڑہ شریف میں تین سال مدرس و ناظمِ تعلیمات اور جامعہ انوار العلوم ملتان میں پینتیس سال صدر المدرسین، شیخ الحدیث اور نائب مہتمم رہے اور اب چار سال سے پھر جامعہ غوثیہ گولڑہ شریف میں مفتی و شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہیں اور تشنگان علم کی پیاس بجھا رہے ہیں۔ غرضیکہ آپ کی مذہبی، ملکی اور تدریسی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

گھریلو زندگی اور اولادِ نرینہ

آپ نے ۱۹۶۲ء میں اپنے خاندان ہی میں شادی کی۔ اللہ نے دو بیٹوں اور دو بیٹیوں سے نوازا، دو بیٹے جناب غلام سبحانی ایم، بی، اے (بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان) اور جناب غلام جیلانی انجینئر (انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور) ہیں دونوں کی بقدرِ ضرورت دینی تعلیم گھر پر ہی مکمل ہوئی۔ آپ کی اہلیہ محترمہ ۲۰۰۴ء میں مدینہ منورہ میں وفات پا گئیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

نسبتِ طریقت

حضرت مولانا مشتاق احمد چشتی مدظلہ ۱۹۵۶ء میں پیر صاحب گولڑہ شریف حضرت بابو جی پیر سید غلام محی الدین گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے دست حق پرست پر گولڑہ شریف میں بیعت ہوئے۔ آپکو شیخ طریقت سے والہانہ محبت تھی اور حضرت قبلہ بابو جی رحمۃ اللہ علیہ بھی آپ سے بہت شفقت فرماتے تھے۔ (اسکی تفصیل فقیر خاندان کے حالات پر مشتمل کتاب ''انوار العارفین'' مصنفہ علامہ ممتاز احمد چشتی مدظلہ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔)

مبارک سفر

۱۹۷۲ء میں پہلی مرتبہ آپ کو حضرت شیخ طریقت قبلہ بابو جی رحمۃ اللہ علیہ کے زیر سایہ حج کی سعادت حاصل ہوئی نیز بغداد شریف، کربلا معلّٰی اور نجف اشرف کی زیارت سے بھی شرف یاب ہوئے اور بغداد شریف میں درگاہِ عالیہ حضرتِ غوث اعظم رضی اللہ عنہ کے مدرس وخطیب الشیخ عبدالکریم محمد نے آپ کو اعزازی سند حدیث عطا فرمائی۔ آپ نے دوسری مرتبہ ۱۹۷۸ء میں مشائخ کرام کی معیت میں حج کی

سعادت حاصل کی اور عمرے متعدد بار کئے۔

تصنیف وتالیف

جامعہ اسلامیہ بہاول پور میں تعلیم کے دوران ۱۹۶۴ء میں آپ نے تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع فرمایا جو ہنوز جاری ہے، اس وقت تک ۱ مقامِ سنت (مطبوعہ) ۲ علم تفسیر اور مفسرین (مطبوعہ)، ۳ ضیاء مہر (مطبوعہ)، ۴ صحیح مسلک (مطبوعہ) ۵ آئینہ معرفت اردو ترجمہ مرأۃ العرفان (مطبوعہ)، ۶ جمع وترتیب قرآن (غیر مطبوعہ) اور اسکے علاوہ ریڈیو پاکستان ملتان اور ریڈیو کے قومی پروگراموں میں آپ نے اسلام کے اخلاقی، تعلیمی، معاشی ومعاشرتی نظام اور دیگر اہم موضوعات پر جو علمی وتحقیقی تقریریں کی ہیں ان سے بھی ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے۔

پسندیدہ مشاغل

آپ کا سب سے زیادہ پسندیدہ مشغلہ تو تدریس ہی ہے البتہ دوسرے مرحلہ میں خطابت وافتاء بھی پسندیدہ مشاغل ہیں۔

علمی تبحر اور وسعتِ مطالعہ

آپ مروجہ علوم وفنون کی کتب اور شروح پر مکمل عبور رکھتے ہیں، ہر فن کمال مہارت سے پڑھاتے ہیں تقریباً تمام ہی درسی کتب پڑھا چکے ہیں لیکن زیادہ تر صحاح ستہ، شرح معانی الآثار، مؤطا امام مالک، مؤطا امام محمد، تفسیر بیضاوی، ہدایہ، قطبی، سلم العلوم، ملاحسن، النحو الواضح، تفسیر جلالین، مشکوٰۃ شریف، شرح عقائد، شرح نخبۃ الفکر الفوز الکبیر وغیرہ کی تدریس فرمائی ہے۔ اسے کمال تواضع کہیے یا نوجوان مدرسین کیلئے تدریسی رویئے میں راہِ عمل کا تعین کہ چند سال قبل بخاری وترمذی وغیرہ کی تدریس کے

دوران جامعہ انوار العلوم میں کریما اور صرف بہائی بھی پڑھائی۔

پاکیزہ خواہش

استاذ العلماء حضرت علامہ مولانا مشتاق احمد چشتی مدظلہ نے مستقبل کے عزائم سے متعلق ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ ”اللہ کرے قال اللہ اور قال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں عمر اختتام پذیر ہو اور اپنے شیخ سے روحانی رابطہ استوار ہو“ جب یہ سوال کیا گیا کہ ”آپ دینی مدارس میں کس چیز کی کمی محسوس فرماتے ہیں؟“ تو فرمایا ”طلبہ میں محنت اور مطالعہ کی کمی“

مشہور تلامذہ

بلاشبہ آپ کے تلامذہ کی تعداد ہزاروں میں ہے جن میں جید علماء و فضلاء مدرس مبلغ، مفتی، شیخ الحدیث، اداروں کے مہتمم اور ناظم بھی شامل ہیں بعض نے مزید تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔ آپ اپنے تمام تلامذہ اور فیض یافتگان کیلئے نہایت شفیق و مہربان ہیں مگر دین متین کی خدمت کیلئے ان کی ہر طرح اور ہمہ وقت مستعدی و آمادگی کو پسند فرماتے ہیں، چنانچہ جب آپ سے یہ سوال کیا گیا کہ ”آپ کے نامور تلامذہ جو آپ کا مشن جاری رکھے ہوئے ہوں؟“ تو فرمایا ”صاحبزادہ علامہ سید ارشد سعید کاظمی (شیخ الحدیث جامعہ انوار العلوم ملتان) مولانا قاضی محمد غوث منصور (مدیر ماہنامہ زمزم و مہتمم مدرسہ انوار القرآن الکریم بہاول پور) مولانا فضل احمد تمیمی و مولانا ظہور احمد نظامی و مولانا محمد قاسم سعیدی (مدرسین جامعہ غوثیہ ہدایت القرآن ملتان) مولانا سراج احمد سعیدی (مہتمم مدرسہ عزیز العلوم اوچشریف) سید سعید احمد شاہ (وائس پرنسپل حزب الرحمٰن اکیڈمی کمالیہ) مولانا محمد شفیع مظہر الحامدی (مفتی و مدرس جامعہ خیر المعاد ملتان) حافظ محمد شفیع چشتی و مولانا محمد رمضان ضیاء الباروی

(مدرسین جامعہ خیر المعاد ملتان) سید فیض عباس قمر بخاری (پرنسپل جامعہ خدیجۃ الکبریٰ بنات الاسلام ٹھٹھہ صادق آباد) مفتی محمد عارف سعیدی (مہتمم جامعہ انوار مصطفیٰ سکھر) پیر سید محمد یٰسین شاہ بخاری (مہتمم جامعہ بخاریہ وخطیب مرکزی جامع مسجد قطب پور) حافظ عبدالعزیز سعیدی (مدرس جامعہ انوار العلوم ملتان) حافظ نوید اختر و مولانا منور حسین و صاحبزادہ صبغۃ اللہ شاہ (جامعہ مہریہ چک R105/6 براستہ فقیر والی ہارون آباد) مولانا مہر علی حلیمی (قلات بلوچستان) مولانا محمد اسلم سعیدی (مہتمم مدرسہ کاظمیہ سعید المدارس جن پور) مفتی محمد سعید سعیدی (انگلینڈ) مولانا محمد اکرم سعیدی (مہتمم مدرسہ کنز العلوم خیر پور سادات علی پور) مولانا محمد اقبال اظہری (مہتمم درسگاہ محمدیہ اظہر العلوم شجاع آباد) پیر سید محمد قمر الدین شاہ (آستانہ عالیہ حضرت پیر امام شاہ گوگڑاں) صاحبزادہ محمد اسماعیل حسنی و صاحبزادہ عبدالرحمٰن حسنی (دار العلوم رحمانیہ حسنیہ رضویہ شاہ والا قائد آباد ضلع خوشاب) پیر سید ظفر علی شاہ (مہتمم و شیخ الحدیث جامعہ غوثیہ مہریہ لودھراں) مولانا عبدالرشید (شیخ الحدیث و ناظم تعلیم جامعہ غوثیہ ہدایت القرآن ملتان) پیرزادہ خورشید احمد شمس القادری (آستانہ عالیہ فتح پور کمال) قاری خادم حسین سعیدی (مہتمم جامعہ عثمانیہ تعلیم القرآن رشید آباد و جامعہ سعیدیہ للبنات خوشحال کالونی ملتان) مولانا محمد یعقوب معینی (کراچی) مفتی خورشید احمد صدیقی (مہتمم مدرسہ رومیہ مسجد طوطلاں ملتان) مولانا غلام محی الدین فیضی (مدرس پکالاڑاں) قاضی غلام ابی بکر (ٹیچر ٹیکنیکل ہائی سکول و مدرس مدرسہ انوار القرآن بہاول پور) قاضی حسین احمد مدنی (لیکچرار اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور شعبہ کامرس) مولانا عون محمد سعیدی (لیکچرار ایس ای کالج، مہتمم و شیخ الحدیث دار العلوم حسنیہ سعیدیہ بہاول پور) قاری محمد صفدر علی سعیدی ملانہ (لیکچرار ہائر سکینڈری سکول وخطیب

جامع مسجد قدیمی بازار والی سرائے سدھو) قاری محمد ہاشم سعیدی (لیکچرار پنجاب کالج وشیخ الحدیث جامعہ سعیدیہ للبنات ملتان) مولانا محمد سلیم سعیدی (خطیب اوقاف ولیکچرار نمل یونیورسٹی اسلام آباد) پیر سید مزمل حسین شاہ کاظمی (بلوچستان مشیر وفاقی شرعی عدالت اسلام آباد) قاری محمد امین سعیدی (خطیب پاکستان آرمی) قاری اللہ دتہ چشتی وقاری محمد عمر سعیدی (مدرسین دورۂ تجوید وقراۃ جامعہ انوار العلوم ملتان) مولانا محمد صادق سیرانی (خطیب جامع مسجد باقر آباد اوقاف نیو ملتان) مولانا سید محمد نور سعیدی (چٹا گانگ بنگلہ دیش) پیر سید محمد اشفاق احمد بخاری (خطیب دربار حضرت پیر اکبر شاہ رحمۃ اللہ علیہ ملتان) پیر محمد نواز شاہ مہروی (مہتمم مدرسہ وخطیب جامع مسجد فریدیہ انصار کالونی ملتان) مولانا محمد میاں نوازی سعیدی (صدر مدرس فیض العلوم ومہتمم کاظمیہ ضیاء الاسلام ملتان) مولانا عبدالرزاق نقشبندی (خطیب پاکستان آرمی) صاحبزادہ سید محمد عالم شاہ (کندھ کوٹ) مفتی محمد حفیظ اللہ مہروی (لودھراں) صاحبزادہ افتخار احمد قادری (ناظم اعلیٰ جامعہ نوریہ ٹرسٹ کوئٹہ) مولانا محمد سعید سعیدی (مدرس جامعہ انوار العلوم ملتان) مولانا غلام محمد سعیدی (صدر مدرس حزب الرحمٰن اکیڈمی دربار قادر بخش شریف کمالیہ) مولانا عبدالحکیم سعیدی (مفتی وصدر مدرس مدرسہ الٰہیہ غوثیہ میاں چنوں) مفتی الطاف احمد چشتی سعیدی (مفتی وصدر مدرس مدرسہ مصباح العلوم میلسی) مولانا عبدالرحمٰن سعیدی وقاری عطا محمد سعیدی (مدرسین دار العلوم حنفیہ دو دروازہ سیالکوٹ) مولانا محمد صابر سعیدی (مفتی وصدر المدرسین جامعہ غوثیہ مہریہ کبیر والا) قاری ربنواز سعیدی (مدرس مدرسہ مصباح العلوم میلسی) مفتی محمد عابد محمود (مفتی وصدر مدرس ادارہ مصباح القرآن بہاول پور) مفتی محمد یٰسین ومفتی محمد صدیق (مدرسین جامعہ فخر العلوم لاہور) ودیگر بہت سے اسماء

جو بخوفِ طوالت درج نہ ہو سکے ان سے معذرت۔

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی

اللہ تعالیٰ نے استاذ العلماء کو حق گوئی کی جو جرأت عطا فرمائی ہے وہ طلبہ اور علماء کیلئے سبق کا درجہ رکھتی ہے۔ ایک واقعہ جسے آپ تحدیث نعمت کے طور پر ذکر فرماتے ہیں قارئین کی نذر کرنا ضروری ہے کہ "۱۹۶۸ء میں جب آپ جامعہ اسلامیہ بہاول پور میں ریسرچ سکالر (محقق) کے طور پر کام کر رہے تھے، مقالہ بھی لکھتے اور اسباق بھی پڑھاتے تھے ان دنوں جامعہ میں ایک سیمینار منعقد ہوا جس میں پنجاب بھر سے کافی تعداد میں علماء وخطباء تشریف لائے جامعہ کا غلام محمد ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

سیمینار کی صدارت کیلئے کمیونسٹ نظریات کا حامل چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف پنجاب مسٹر مسعود کھدر پوش آیا وہ شخص اپنے باطل اور ملحدانہ نظریات میں اپنی مثال آپ تھا۔ اپنی تقریر میں اس نے علماء پر تنقید کی، تحقیر کے الفاظ بولے اور اسلام کا نام رسمی انداز میں ذکر کرتے ہوئے کہا جہاں مادی طاقت ہو وہاں ایمان کیا کر سکتا ہے، جہاں توپ کا گولہ گرے وہاں ایمان کیا کر سکتا ہے اس پر علامہ مولانا مشتاق احمد کھڑے ہوئے اور چیف کے ریمارکس پر سخت احتجاج کیا اور اپنا موقف بیان کرنے کیلئے صدر اجلاس سے وقت مانگا۔ علامہ ممتاز احمد چشتی جو آپ کے عزیز ہیں اس وقت جامعہ اسلامیہ میں زیرِ تعلیم تھے انہوں نے اور انکے برادرِ عزیز فقیر محمد نواز صاحب نے تائید کی اور کچھ دیر پہلے کی افسوسناک صورت حال کہ "علماء میں سے کسی نے بھی کھدر پوش کی بدزبانی پر کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا تھا" یکسر بدل گئی اور ہر طرف اِن حضرات کی آواز گونجنے لگی، صدر اجلاس نے مجبوراً وقت دیا تو علامہ مشتاق احمد چشتی نے ایمان کی اہمیت کو واضح کیا اور بڑے واشگاف انداز میں مسعود کھدر پوش کی تردید کی۔ آخر وہ ذلیل ہو کر

عقبی دروازے سے نکل گیا اور اس طرح حق کا بول بالا ہوا۔ اس واقعے سے حق گوئی اور صداقت کا جو سبق ملتا ہے امید ہے طلبہ کرام اس سے نصیحت حاصل کریں گے۔

"مقام سنت" آپ کی اہم تصنیف ہے اس کی اشاعت کا اعزاز مکتبہ مہریہ کاظمیہ نیو ملتان کو حاصل ہو رہا ہے (انشاء اللہ العزیز "علم تفسیر اور مفسرین" اور "جمع و ترتیب قرآن" بھی نئی کمپوزنگ سے جلد شائع کی جائیں گی) یہ گرانقدر تصنیف جہاں منکرین حدیث کے اعتراضات کا تحقیقی جواب ثابت ہوئی ہے، وہاں اہل علم و تحقیق کے ہاں ایک بلند پایہ ماخذ کی حیثیت سے بھی جگہ پا چکی ہے۔ اس کتاب کی وقعت اور مصنف مدظلہ کی عظمت کیلئے یہی کافی ہے کہ اس کی تقریب (مقدمہ) غزالی زماں امام اہل سنت حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کے مستند قلم کا فیضان ہے۔ اللہ تعالیٰ بجاہ حبیبہ الاعلیٰ ﷺ قبولیت کا شرف عطا فرمائے، آمین۔

عبدالعزیز سعیدی

۲۴ رمضان المبارک ۱۴۲۸ھ

مطابق سات اکتوبر ۲۰۰۷ء

تقریب

از غزالی زماں امام اہلسنت

حضرت علامہ سید احمد سعید شاہ صاحب کاظمی رحمۃ اللہ علیہ

مہتمم وسابق شیخ الحدیث جامعہ انوار العلوم ملتان

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى

اَمَّا بَعْدُ. تاریخ اسلام میں فتنہ انکار حدیث کا آغاز خوارج کے ظہور سے ہوا جسے معتزلہ کے دور میں خاصی تقویت پہنچی مگر ائمہ راسخین اور علمائے دین نے اپنی علمی اور روحانی قوتوں کو بروئے کار لاکر اسے روکا، اس کے بعد مادہ پرستی، الحاد اور لادینی کا دور آیا جس میں اسے دوبارہ سر اٹھانے کا موقع ملا، گویا فتنۂ انکارِ حدیث کی دبی ہوئی چنگاری خرمن ایمان کو جلانے کے لئے بھڑک اٹھی جسے بجھانے کی کوشش کرنا ہر اہل علم مسلمان کا فرضِ اولین ہے، زیر نظر مقالہ اسی جدوجہد کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

فاضل جلیل مولانا مشتاق احمد صاحب گولڑوی کا یہ مقالہ معاندین سنت اور منکرین حدیث کے سر پر گویا ضرب قلیم ہے۔ اس مقالہ میں بحث کے ہر پہلو کو دلائل و براہین کی روشنی میں اجاگر کیا گیا ہے، منکرین و معاندین

کے تمام اعتراضات اور شکوک وشبہات کا پوری طرح ازالہ کر دیا گیا ہے، انداز بیان دلکش اور دلنشین ہے، زبان نہایت سلیس اور دلائل انتہائی قوی ہیں، منکرین سنت کے پاس کوئی مضبوط دلیل نہیں، بدعقیدگی کی بنا پر ان کی طرف سے چند اعتراضات پیش کیے جاتے ہیں جو شکوکِ ضعیفہ واوہام رکیکہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے ہیں۔

مادی اور لادینی طاقتوں کے سہارے یہ فتنہ اُبھر رہا ہے لیکن جس طرح یہ نشاۃِ اولیٰ کے دور میں ناکام رہا، انشاء اللہ اب بھی کامیاب نہ ہو سکے گا اور کتاب وسنت کی روشنی میں دین اسلام اور شریعت کا حسن وجمال ہمیشہ چمکتا رہے گا۔

منکرین حدیث کے اہم ترین شکوک وشبہات حسب ذیل ہیں۔

۱۔قرآن کریم جامع اور مکمل کتاب ہے اس لئے حدیث کی ضرورت نہیں۔

۲۔احادیث کا مجموعہ عہد رسالت سے تقریباً دوڈھائی سو سال بعد میں جمع ہوا لہٰذا قابل اعتماد نہیں۔

۳۔احادیث ظنی ہیں اور اتباع ظن کی مذمت قرآن مجید میں وارد ہے اس لئے وہ قابل اتباع نہیں۔

۴۔اکثر احادیث قرآن کے خلاف ہیں، اس لئے قابل قبول نہیں۔

۵- احادیث میں تعارض ہے اس لئے وہ معتبر نہیں۔

جامع اور مختصر الفاظ میں نمبر وار اِن کا ازالہ ہدیہ ناظرین ہے۔

۱- بے شک قرآن جامع اور مکمل کتاب ہے مگر ہم اس کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لئے اس کی تفسیر و توضیح کے محتاج ہیں، حدیث اس کی تفسیر و توضیح ہے لہٰذا ہمیں اس کی ضرورت ہے۔

یہاں یہ شبہ وارد کرنا درست نہیں کہ قرآن واضح اور مفصل ہے لہٰذا اس کی تفسیر و توضیح کے لئے حدیث کی حاجت نہیں کیونکہ قرآن پاک کا واضح اور مفصل ہونا حدیث نبوی اور بیانِ رسالت کی روشنی میں ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (کتاب و حکمت کا سکھانا نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کام ہے) تعلیم نبوی کے بغیر کتاب کا علم حاصل نہیں ہوسکتا، دوسری جگہ فرمایا لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ، معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نازل فرمودہ کتاب کا بیان رسول (ﷺ) کا کام ہے۔ ورنہ بتائیے کہ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ کا بیان اور اقامتِ صلوٰۃ کی تفصیل اور اسی طرح اداءِ زکوٰۃ کی توضیح قرآن کے الفاظ میں کہاں ہے؟ بیانِ رسول (ﷺ) کی روشنی میں پانچ نمازوں، ان کی رکعتوں کی تعداد اور مقادیر زکوٰۃ کا علم ہمیں حاصل ہوا۔

یہاں یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آگئی کہ سنت و حدیث کتاب اللہ کا معنٰی ہے اور ظاہر ہے کہ اَلْقُرْاٰنُ اِسْمٌ لِلنَّظْمِ وَالْمَعْنٰى جَمِيْعًا (لفظ

اور معنٰی دونوں کا مجموعہ قرآن ہے) ثابت ہوا کہ سنتِ نبوی اور حدیثِ رسول عین قرآن ہے جس کا انکار قرآن کا انکار ہے۔ رہا یہ شبہ کہ قرآن قطعی ہے اور حدیث ظنی اگر حدیث کو قرآن کا معنٰی قرار دے کر اسے عین قرآن کہا جائے تو قرآن بھی ظنی ہوگا، ہرگز قابل اعتناء نہیں کیونکہ ہم نے جس سنت اور حدیث کو عین قرآن قرار دیا ہے وہ سنتِ متواترہ اور حدیثِ متواتر قطعی ہے، جیسے نمازوں کے پانچ ہونے کی حدیثیں اور تعداد رکعات کی روایات، ارکانِ صلوٰۃ و مقادیر زکوٰۃ کے بیان میں قطعی اور متواتر احادیث یقیناً عین قرآن کے حکم میں ہیں جن کا انکار الفاظِ قرآن کے انکار کی طرح کفر ہے۔

باقی رہیں وہ احادیث جو اخبارِ آحاد ہیں تو اگرچہ وہ عین قرآن نہیں مگر متعلقاتِ قرآن سے ضرور ہیں، اس قسم کے ظنیات الفاظ قرآن کے متعلقات میں بھی پائے جاتے ہیں تمام قراءاتِ آحاد اسی قبیل سے ہیں جن کا انکار ممکن نہیں۔ اسی طرح ان احادیثِ آحاد کا انکار بھی شرعاً ممکن نہیں جو باعتبار معنٰی متعلقاتِ قرآن سے ہیں، اسی بنا پر ادلہ شرعیہ کی چار قسمیں ہیں:

۱۔ قطعی الثبوت قطعی الدلالۃ
۲۔ قطعی الثبوت ظنی الدلالۃ
۳۔ ظنی الثبوت ظنی الدلالۃ
۴۔ ظنی الثبوت قطعی الدلالۃ

پہلی قسم کی مثال جیسے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کہ اس کا ثبوت اور دلالت دونوں قطعی ہیں اور دوسری قسم جیسے یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ کہ یہاں لفظِ قُرُوْءٌ منقول متواتر ہونے کی وجہ سے قطعی الثبوت ہے مگر حیض یا طہر پر اس کی دلالت ظنی ہے اور لفظِ قُلَّة کے معانی متعددہ میں سے کسی ایک معنٰی پر اس کی دلالت بھی ظنی ہے۔

چوتھی قسم کی مثال حدیث لَوْ كَانَ بَعْدِیْ نَبِیٌّ لَكَانَ عُمَرَ ہے کہ خبر واحد ہونے کی وجہ سے اس کا ثبوت ظنی ہے مگر اپنے معنٰی پر اس کی دلالت قطعی ہے، ثابت ہوا کہ ظنیت کو مطلقاً قرآن کے منافی قرار دینا درست نہیں۔

دوسرے شبہ کا ازالہ، کسی بات کا محفوظ رہنا ضبطِ کتابت پر منحصر نہیں، ضبطِ صدر بھی حفاظت کے لئے کافی ہے بلکہ ان دونوں میں اصل ضبطِ صدر ہی ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک کے نسخوں میں کتابت کی غلطی بذریعہ حفاظ نکالی جاتی ہے۔

اسانیدِ صحیحہ کے ساتھ احادیثِ نبویہ عہدِ صحابہ سے لے کر تدوین حدیث کے دور تک محدثین کے سینوں میں محفوظ رہیں، اسناد امت محمدیہ کا خاصہ ہے اُمم سابقہ میں سے کوئی امت ایسی نہیں پائی گئی جس نے اپنے نبی کی کسی بات کو سند متصل کے ساتھ نقل کیا ہو جس کی حکمت یہ ہے کہ شریعت

محمدیہ آخری شریعت ہے اس لئے قیامت تک نبی آخر الزماں ﷺ کی سنت کریمہ اور سیرتِ طیبہ کا محفوظ رہنا ضروری ہے، اس کے بغیر قرآن کا سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ناممکن ہے۔ چنانچہ راویانِ حدیث کے جملہ احوال کو محدثین نے ضبط کیا، علم اسماء الرجال کی وسعتِ بے پایاں کو ملاحظہ فرمائیں جس کی روشنی میں جھوٹ اور سچ دن اور رات کی طرح نمایاں ہو گیا۔

عہدِ رسالت سے لے کر مصنفینِ کتبِ حدیث تک کوئی دور ایسا نہیں جس میں ضبط اور تدوین مفقود ہو، یہ تسلسل اور اتصال اس شبہ کا استیصال کرنے کے لئے کافی ہے۔

نفسِ کتابتِ حدیث عہدِ نبوت سے لے کر آخر تک ثابت ہے البتہ موجودہ کتب کی صورت میں احادیث کی نشر و اشاعت میں تاخیر ہوئی مگر اس سے احادیث کے ثبوت میں کوئی شبہ پیدا نہیں ہوتا ورنہ عہدِ عثمانی تک جمعِ قرآن کی تاخیر بھی اس قسم کے شبہات کی بنیاد بن سکتی ہے (اَلْعِیَاذُ بِاللّٰہِ الْکَرِیْمِ)

تیسرے شبہ کے ازالہ میں گزارش ہے کہ تمام احادیث ظنی نہیں بلکہ احادیثِ متواترہ، عام ازیں کہ ان کا تواتر لفظی ہو یا معنوی، بہر صورت قطعی ہیں ہاں! اخبارِ آحاد ظنی ہیں مگر ان کی ظنیت موجبِ رد نہیں۔ منکرین حدیث کا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے ظن کی اتباع سے روکا ہے اور اسے مذموم قرار دیا ہے لہٰذا اخبارِ آحاد کی اتباع جائز نہیں دجل و فریب ہے۔

قرآن نے تین قسم کے ظن کی مذمت فرمائی ہے۔ ایک وہ جو سوء پر مبنی ہو جسے سوءِ ظن کہتے ہیں، اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ سے یہی مراد ہے۔ دوسرے ظن جاہلیت سے روکا ہے۔ تیسرے وہ ظن جو حق کے مقابل اور اس کے خلاف ہو، اس کے متعلق فرمایا اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا، یہ وہی ظن ہے جو حق کے مقابل ہو اور دلیل قطعی اس کے خلاف پر پائی جائے، ایسا ظن واقعی مردود ہے۔ مثلاً کوئی خبر واحد آیتِ قرآنیہ کے صریح خلاف پائی جائے تو وہ یقیناً واجب الرد ہے لیکن ہمارا کلام تو ان اخبارِ آحاد میں ہے جو کسی آیت یا حدیث متواتر کے خلاف نہ ہوں بلکہ قرآن کی تفسیر و توضیح کرتی ہوں، ان کی اتباع کو مذموم کہنا خود مذموم ہے۔

اخبارِ آحاد اور دلیل ظنی کو خود قرآن نے معتبر مانا ہے وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا "زلیخا کے اہل سے ایک گواہ نے (یوسف علیہ السلام کی برأت پر) گواہی دی" یہاں صرف ایک گواہ کی گواہی کا ذکر ہے۔ سورۃ القصص میں ہے وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَى الْمَدِیْنَةِ یَسْعٰی "ایک آدمی شہر کے پرلے کنارے سے دوڑتا ہوا آیا" اس نے موسیٰ علیہ السلام کو خبر دی کہ لوگ آپ کے قتل کا مشورہ کر رہے ہیں، آپ یہاں سے چلے جائیں چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے ایک آدمی کی خبر پر اعتماد کیا اور وہاں سے چلے گئے۔

نیز قرآن مجید میں فرمایا اِسْتَشْهِدُوْا شَهِیْدَیْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ الآیة

یعنی صرف دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنانے کا حکم دیا، زنا پر چار گواہ طلب کئے اور فرمایا اَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ظاہر ہے کہ تواتر کے بغیر قطعیت پیدا نہیں ہوتی دو گواہ ہوں یا چار بہرحال ان کی بات ظنی ہوگی مگر قرآن نے اسے ثبوت کے طور پر تسلیم کیا، معلوم ہوا کہ اخبارِ آحاد اور دلائل ظنیہ کو مطلقاً ناقابل قبول کہنا قرآن کی روشنی میں قطعاً غلط ہے۔

چوتھے شبہ کے بارے میں عرض ہے کہ جو حدیثیں فی الواقع صحیح اور ثابت ہیں ان میں درحقیقت کوئی تعارض نہیں پایا جاتا، بظاہر کسی کو تعارض نظر آئے تو وہ فہمِ ناظر پر مبنی ہے، اس قسم کا تعارض ملحدین نے آیات قرآنیہ میں بھی پیدا کر دیا جس کی کوئی حقیقت نہیں، اسی طرح احادیثِ صحیحہ ثابتہ کا ظاہری تعارض بھی بے حقیقت ہے۔

پانچواں شبہ، کہ اکثر احادیث قرآن کے خلاف ہیں، پرِ کاہ کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتا، اس شبہ کی بنیاد منکرین کا یہ خیال ہے کہ جو بات قرآن میں صراحۃً مذکور نہ ہو اور حدیث میں آجائے تو وہ خلافِ قرآن ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے، صلواتِ خمسہ، تعدادِ رکعات، مقادیر زکوۃ اور بے شمار تفصیلات قرآن میں صراحۃً مذکور نہیں، جن احادیث میں وہ تفصیلات مذکور ہیں، کیا انہیں خلاف قرآن کہا جائے گا اور اگر بالفرض کوئی احمق انہیں خلاف قرآن کہتا ہے تو وہ اقامتِ صلوٰۃ اور ادائِ زکوۃ کا فریضہ کس طرح ادا کریگا۔

معلوم ہوا کہ خلاف قرآن کے یہ معنٰی غلط ہیں بلکہ وہ باتیں خلاف قرآن ہوں گی جو قرآن کے کسی حکم کی نفی کرتی ہوں، یعنی قرآن میں کسی بات کا ثبوت ہو اور حدیث میں اس کی نفی پائی جائے یا قرآن میں کسی بات کی نفی ہو اور حدیث میں اس کا ثبوت وارد ہو تو یقیناً وہ حدیث قرآن کے خلاف ہوگی مگر احکام قرآن کی تشریح جن احادیث میں وارد ہوئی انہیں کسی طرح بھی خلافِ قرآن قرار نہیں دیا جا سکتا، مثلاً شادی شدہ آزاد مسلمان مرد وعورت کے لئے زنا کی سزا سنگسار کرنا قرآن مجید میں صراحۃً مذکور نہیں، احادیث میں وارد ہے، منکرین اسے خلافِ قرآن قرار دیتے ہیں۔

ہم بار بار عرض کر چکے ہیں کہ ارشاداتِ قرآنیہ میں مرادِ الٰہی کا بیان منصبِ رسالت ہے **يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ** اور **لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَيْهِمْ** ودیگر آیات روزِ روشن کی طرح اس حقیقت کو واضح کر رہی ہیں، بنظر انصاف دیکھا جائے تو رجم کا مسئلہ بالکل اسی نوعیت کا ہے، سورۃ النساء میں اللہ تعالیٰ نے زانیہ عورتوں کے بارے میں فرمایا کہ ان کی بدفعلی پر چار گواہ بنالو اور انہیں گھروں میں مقید رکھو **حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْيَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا** یہاں تک کہ انہیں موت آجائے یا اللہ تعالیٰ ان کے لئے کوئی راہ پیدا کر دے۔

معلوم ہوا کہ اس آیتِ کریمہ کے نزول تک زنا کی کوئی حد اللہ

تعالیٰ کی طرف سے مقرر نہیں ہوئی تھی البتہ اشارۃً اس کا ذکر کر دیا گیا تھا اور وہ اشارہ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰہُ لَھُنَّ سَبِیْلًا میں مذکور ہے جس کی وضاحت غیر شادی شدہ کے حق میں سورۂ نور کی آیت اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ میں فرما دی گئی اور شادی شدہ زانی وزانیہ کی سزا سورۃ المائدہ میں توراۃ کے حکمِ رجم کو قرآنی شریعت میں شامل فرما کر کر دی گئی اور ارشاد فرمایا وَکَیْفَ یُحَکِّمُوْنَکَ وَعِنْدَھُمُ التَّوْرَاۃُ فِیْھَا حُکْمُ اللّٰہِ. اس آیتِ مبارکہ میں حکمُ اللّٰہ سے مراد شادی شدہ عورتوں کا رجم ہے جیسا کہ رسولِ کریم ﷺ کے عمل مبارک سے اس کا قطعی ثبوت موجود ہے۔ توراۃ کے بعض دیگر احکامات کو بھی شریعت محمدی میں شامل فرمایا گیا جیسا کہ اسی سورۂ مائدہ میں ہے وَکَتَبْنَا عَلَیْھِمْ فِیْھَا اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَیْنَ بِالْعَیْنِ الآیۃ جس طرح تورات کا یہ حکمِ قصاص شریعت محمدی کا حکم قرار دیا گیا بالکل اسی طرح تورات کا حکم رجم بھی شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا التحیۃ کے احکام میں شامل ہو گیا اور یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آ گئی کہ سورۃ النور کی آیت اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ میں قطعاً غیر شادی شدہ زانی اور زانیہ کی سزائیں مراد ہیں۔

منکرین حدیث یہاں ایک ضعیف شبہ وارد کرتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے اللہ تعالیٰ نے زانیہ باندی کی سزا زانیہ محصنہ کی سزا کی نسبت

نصف قرار دی ہے، سورۃ النساء میں فرمایا فَاِنْ اَتَیْنَ بِفَاحِشَۃٍ فَعَلَیْھِنَّ نِصْفُ مَا عَلَی الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ۔ محصنات کے معنٰی ہیں شادی شدہ عورتیں ایسی صورت میں اگر شادی شدہ زانیہ کی سزا رجم ہو تو باندی کی سزا محصنات کی سزا کا نصف نہیں ہو سکتی کیونکہ رجم کی تنصیف ناممکن ہے، اس لئے محصنات کی سزا سو کوڑے ہی ہو سکتے ہیں جن کا نصف پچاس کوڑے زانیہ باندی کو مارے جائیں گے، حیرت ہے کہ منکرین حدیث نے نِصْفُ مَا عَلَی الْمُحْصَنٰتِ میں محصنات کے معنٰی شادی شدہ عورتیں سمجھ لئے۔

منکرین حدیث کا یہ شبہ حیرت انگیز ہے، کاش وہ اس آیت کے ابتدائی حصہ کو دیکھ لیتے تو انہیں قرآن میں اس تحریفِ معنوی کی جرأت نہ ہوتی۔ اس آیت کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ مِنْکُمْ طَوْلًا اَنْ یَّنْکِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنَاتِ فَمِنْ مَّا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ مِنْ فَتَیَاتِکُمُ الْمُؤْمِنَاتِ یعنی تم میں سے جو شخص (غیر مملوکہ) آزاد ایمان والی عورتوں سے شادی نہ کر سکتا ہو تو وہ ایمان والی مملوکہ باندیوں سے نکاح کر سکتا ہے۔ یہاں محصنات کو فتیات مملوکات کے مقابلہ میں ذکر کیا گیا ہے، ایسی صورت میں محصنات سے مراد قطعاً غیر شادی شدہ آزاد عورتیں ہیں جو کسی کی مملوکہ نہ ہوں نہ وہ کسی کی منکوحہ ہوں کیونکہ منکوحہ غیر سے نکاح حرام ہے۔

ظاہر ہے کہ کنواری آزاد عورت اگر زنا کرے تو اس کی سزا رجم نہیں

بلکہ سو کوڑے ہیں، اس کی نصف یعنی پچاس کوڑے باندیوں کی سزا مقرر ہوتی، منکرین حدیث نے ہر جگہ محصنٰت کے معنٰی شادی شدہ عورتیں سمجھ رکھے ہیں، یہ ان کی لاعلمی اور غلط فہمی ہے، دراصل محصنات کے معنٰی ہیں وہ عورتیں جو حصار میں ہوں، حصار تین ہیں۔ اسلام، حریت اور نکاح، قرآنِ مجید میں محصنات کا لفظ منکوحہ عورتوں کے لئے بھی وارد ہے جیسے وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَّ النِّسَآءِ اِلَّا مَامَلَکَتْ اَیْمَانُکُم ......

یہاں المحصنٰت سے منکوحات مراد ہیں لیکن منکرین حدیث کی پیش کردہ اس آیت سے شادی شدہ عورتیں مراد نہیں بلکہ مسلمان کنواری آزاد عورتیں مراد ہیں جو نکاح کے حصار میں نہیں بلکہ اسلام اور حریت کے حصار میں ہونے کی وجہ سے محصنات قرار پائیں جیسا کہ اس آیت کے ابتدائی حصہ سے وَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ مِنْکُمْ طَوْلًا اَنْ یَّنْکِحَ الْمُحْصَنٰتِ کے الفاظ نقل کر چکے ہیں کہ یہاں محصنات سے کنواری آزاد عورتیں مراد ہیں، اسی طرح حلال عورتوں کے بیان میں سورۃ المائدہ کی آیت ہے وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ ، یہاں بھی المحصنات سے دونوں جگہ غیر شادی شدہ عورتیں مراد ہیں کیونکہ منکوحہ سے نکاح حرام ہے۔

واضح ہو کہ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ سے مراد آزاد کنواری عورتوں کی سزا ہے اور وہ سو کوڑے ہی ہے جس کا نصف پچاس کوڑے باندیوں کی سزا مقرر کی گئی "وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ" منکرینِ حدیث کا رجم کو خلافِ قرآن قرار دینا ایک مغالطہ تھا جو اس بیان سے دور ہو گیا۔

ہر منصف مزاج اہل علم اس حقیقت کو سمجھ سکتا ہے کہ قرآن مجید کے احکام کی وضاحت احادیث سے ہی مل سکتی ہے۔ یہ لوگ تاریخی واقعات کو تسلیم کر لیتے ہیں حالانکہ وہ معتبر اور متصل اسانید سے منقول نہیں ہوتے لیکن احادیثِ نبویہ کو نہیں مانتے جبکہ ان کی اسانید معتبرہ متصلہ سب کے سامنے موجود ہیں، رجم کی احادیث تو اس قدر مشہور و معروف ہیں کہ تاریخی نقطہ نظر سے بھی ان کا انکار ناممکن ہے، عہدِ رسالت اور عہدِ خلافتِ راشدہ میں رجم پر عمل ہوا، اسلامی حکومتوں کا کوئی دور ایسا نہیں جس میں رجم کو متروک قرار دیا گیا ہو اور ان کا ثبوت شہرت و تواتر سے ہم تک پہنچا قرآن میں اصل حکم موجود ہے، البتہ اس کی وضاحت حدیث اور سنتِ نبوی میں پائی گئی، اسی صورت میں ان احادیث کو خلافِ قرآن قرار دینا دینِ متین اور شریعتِ محمدیہ کو مسخ کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ اس فتنہ سے بچائے اور اپنے دین کو

دشمنانِ دین سے محفوظ رکھے۔ امین،

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ وَنُوْرِ عَرْشِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ.

الفقیر السید احمد سعید الکاظمی غفرلہ

۸ فروری ۱۹۷۷ء

حامداً ومصلیاً

پیش لفظ

اہل علم حضرات سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ کتاب وسنت میں ایسا باہمی گہرا ربط ہے کہ ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو تھامنا ناممکن ہے، یہی دو وہ بنیادی اصول ہیں جن پر دین کی پوری عمارت قائم کی گئی ہے، یہی وہ بنیادی حقیقی اصول ہیں جنہیں قرآنِ مجید نے عروۂ وثقیٰ اور حبل متین سے تعبیر کیا ہے اور ان سے تعلق وتمسک کو بنیادِ ہدایت قرار دیا اور ان سے علیحدگی اور لاتعلقی کو بنیادِ ضلالت ٹھہرایا ہے، رسول کریم ﷺ نے اسی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

تَرَكْتُ فِيكُمْ اَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَاتَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا كِتَابُ اللّٰهِ وَسُنَّةُ رَسُوْلِهٖ. (الحدیث)[1]

"میں تم میں دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں، اگر تم انہیں مضبوطی سے تھامے رہو گے تو گمراہ نہیں ہو گے، ان میں ایک تو اللہ کی کتاب ہے اور دوسری رسولِ خدا ﷺ کی سنت ہے"۔

تاریخ شاہد ہے کہ جب تک مسلمانوں نے کتاب وسنت سے قلبی رابطہ قائم رکھا اور ان کی اہمیت وعظمت کو پیشِ نظر رکھا تو کسی فتنے کو سر اٹھانے

---

[1] مؤطا امام مالک، باب النہی عن القول فی القدر، ص ۷۰۲۔ ایضاً مستدرک حاکم ج ۱ ص ۹۳۔

کی جرأت نہ ہوئی لیکن جب سے بعض کوتاہ اندیشوں نے حدیث کی اہمیت کو گھٹانے کی کوشش کی اور اس شہ رگ کو کاٹنے کی حماقت کی، اسلامی نظام حیات کی برکات سے لوگ محروم ہو گئے۔

تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ پہلی صدی ہجری کے اختتام تک مسلمان حدیث کی اہمیت پر متفق رہے۔ دوسری صدی ہجری کے اوائل میں اس فتنے نے سر اُٹھایا چنانچہ حافظ ابن حزم اندلسی لکھتے ہیں:

وَاَیْضًا فَاِنَّ جَمِیْعَ اَهْلِ الْاِسْلَامِ كَانُوْا عَلٰی قُبُوْلِ خَبَرِ الْوَاحِدِ الثِّقَةِ مِنَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَجْرِیْ عَلٰی ذٰلِکَ كُلُّ فِرْقَةٍ فِیْ عِلْمِهَا كَاَهْلِ السُّنَّةِ وَالْخَوَارِجِ وَالشِّیْعَةِ وَالْقَدَرِیَّةِ حَتّٰی حَدَثَ مُتَكَلِّمُوا الْمُعْتَزِلَةِ بَعْدَ الْمِائَةِ مِنَ التَّارِیْخِ فَخَالَفُوْا الْاِجْمَاعَ فِیْ ذٰلِکَ.[1]

تمام مسلمان رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت شدہ خبر واحد کے قبول کرنے پر متفق تھے اور اس پر تمام فرقے اہل سنت، جبریہ، قدریہ، شیعہ بھی اپنے علم کے مطابق عمل پیرا تھے یہاں تک کہ پہلی صدی ہجری کے بعد متکلمینِ معتزلہ کا دور آیا جنہوں نے اس اجماع کی مخالفت کی"۔

خوارج اور معتزلہ نے سب سے پہلے فتنۂ انکار حدیث کو ہوا دی

خوارج کو انکار سنت کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ وہ ملت میں جو انتشار

---

[1] الاحکام فی اصول الاحکام ج ۱ ص ۱۱۴۔

اور افتراق پھیلانا چاہتے تھے سنت رسول ﷺ اس کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ تھی ان کی راہ میں رسول اکرم ﷺ کے وہ ارشادات حائل تھے جو اُن کے انتہا پسندانہ نظریات کے برخلاف ایک معتدل مسلک کی دعوت دیتے تھے اس لئے انہوں نے سنت کے بارے میں طرح طرح کے شکوک وشبہات ڈالنے اور اس کے واجب الاتباع ہونے کی حیثیت کو کم کرنے کی کوشش کی، معتزلہ نے سنتِ رسول کے بارے میں اس لئے غلط نظریہ پیش کیا کیونکہ وہ یونانی فلسفہ سے بے حد متاثر تھے اور اس حد تک ذہنی طور پر شکست خوردہ تھے کہ فلسفہ یونان کے آگے قرآنی حقائق توڑ مروڑ کر پیش کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ سننِ نبویہ کا بہت بڑا ذخیرہ ایسا ہے جو فلسفہ یونان کے نظریات سے متصادم ہے تو انہوں نے احادیث کی حجت سے انکار کرنا شروع کر دیا، تاہم یہ انکار اخبارِ آحاد تک محدود تھا۔

اس دور کے علماءِ ربانیین نے اس فتنے کا بڑی جرأت اور پامردی سے مقابلہ کیا چنانچہ سب سے پہلے امامؒ شافعی نے اپنی مشہور تصنیف ”الرسالہ“ اور ”کتاب الام“ کی ساتویں جلد میں اس فتنہ کا رد کیا اور سنت کی اہمیت کو واضح کیا۔ امام احمد بن حنبل نے بھی اس سلسلے میں ایک جزء تصنیف کی جس کا کچھ حصہ علامہ ابن قیم نے اعلام الموقعین کی دوسری جلد میں نقل کیا ہے۔ اسی طرح امام غزالی نے ”المستصفی“ میں اور حافظ ابن حزم نے

"الاحکام فی اصول الاحکام" میں اور محمد بن ابراہیم وزیر نے "الروض الباسم" میں سنت کی اہمیت کو واضح کیا اور فتنہء انکارِ سنت کا بلیغ رد کیا۔ متاخرین میں علامہ جلال الدین سیوطی نے بھی اس موضوع پر رسالہ تصنیف کیا بعد میں یہ مسئلہ اصول فقہ کی کتابوں کا جز بن گیا۔

علماءِ کرام کی مسلسل کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ فتنہ کافی عرصہ تک دبا رہا اور اسے سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی۔ پھر اس فتنے نے تیرہویں صدی میں سر اٹھایا لیکن اب اس کا مرکز عراق کی بجائے ہند کی سرزمین بنی۔ سب سے پہلے سر سیّد احمد خاں اور مولوی چراغ علی نے اس کی ابتداً کی پھر مولوی عبداللہ چکڑالوی نے اس کا بیڑا اٹھایا، بعد میں مولوی احمد الدین امرتسری نے اس کی قیادت کی، پھر جناب اسلم جیراجپوری اس فتنے کو لے کر آگے بڑھے، پھر اس کی قیادت ان کے شاگرد رشید چودھری غلام احمد پرویز کے حصے میں آئی جنہوں نے رفتہ رفتہ اسے ضلالت کی آخری حد تک پہنچا دیا۔ چند سال ہوئے ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاری نے بھی بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے اس فتنے کو ہوا دینے کی کوشش کی ہے، ان کے سامنے ان کے پیشرؤوں کی غلطیاں بھی ہیں اور وہ تلخ تجربے بھی جو اس تحریک کی ناکامی کے اسباب بنے، اس لئے انہوں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اس میدان میں قدم رکھا ہے۔ انہوں نے ادارہ تحقیقاتِ اسلامیہ کے مجلّہ "فکر ونظر" میں جو کچھ لکھا ہے ہم نے اسے غور سے پڑھا ہے اور بار بار پڑھا ہے جس کے بعد ہم اس

نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اِن کا فتنہ اُن منکرین سنت سے بھی زیادہ خطرناک ہے جو کھلم کھلا سنت رسول ﷺ کی حجیت کا انکار کرتے ہیں۔ یہ صاحب اپنے آپ کو سنت کا قائل ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور قارئین کو بار بار اس مغالطے میں ڈالنے کی سعی میں مصروف ہیں کہ وہ سنت کو ایک حقیقتِ ثابتہ تسلیم کرتے ہیں، مستشرقین کے تصورِ سنت پر کہیں کہیں تنقید بھی کرتے ہیں لیکن باتوں باتوں میں وہی کچھ کہہ جاتے ہیں جو مستشرقین کہتے ہیں۔ سنت کو برائے نام تسلیم بھی کرتے ہیں لیکن سنت کی تشریح اس انداز میں کرتے ہیں جس سے کم از کم جمہور اہل اسلام تو ضرور نا آشنا ہیں۔ وہ سنت کو ارتقاً پذیر ثابت کرنے کے لئے حالاتِ زمانہ کے مطابق اس میں ترمیم و تنسیخ کو نہ صرف جائز بلکہ جزوِ سنت سمجھتے ہیں اور پھر ان کی جرأت دیکھئے کہ اس مذموم اندازِ فکر میں خلفاءِ راشدین اور ائمہ مجتہدین کو بھی اپنا ہم نوا ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔

ان کی ایک اور گہری چال بھی خاص طور پر قابل غور ہے کہ سنت اور حدیث کے درمیان بُعد کو ثابت کرنے کے لئے ''تحریکِ حدیث'' کو سنت کا مخالف اور اتباعِ سنت کو اتباعِ حدیث کا مخالف قرار دیتے ہیں، سنن نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں ان کے خیالات کچھ اس قسم کے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے بہت ہی تھوڑا ذخیرۂ سنن چھوڑا اور وہ بھی ان کے خیال میں غیر واضح اور ناکافی تھا، سنت کی آئینی حیثیت سے انحراف کرنے

کے لئے انہیں یہ کہتے ہوئے بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوئی کہ رسول اکرم ﷺ کو قومی ریاست کی تنظیم میں مشغول رہنے کی وجہ سے اتنا وقت نہیں ملا کہ وہ زندگی کے لئے قوانین مرتب فرماتے۔

سنت کے بارے میں غلط نظریہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تحریر سے یہ بات بھی نمایاں ہو جاتی ہے کہ وہ صحیح احادیث کے بارے میں بھی خواہ مخواہ شبہات ڈالنے کے بارے میں اپنے پیشرؤوں سے کچھ زیادہ پیچھے نہیں، ہم نے مختلف روایات پر ان کے تنقیدی ریمارکس دیکھے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ذہن میں پہلے سے ایک مفروضہ قائم کر لیتے ہیں کہ یہ حدیث فلاں دور میں وضع کی گئی ہوگی، اس کے لئے فلاں فلاں عوامل اور محرکات ہوں گے۔ وہ اصول فن کی روشنی میں نہ تو متن پر کوئی کلام کر سکتے ہیں اور نہ ہی سند پر کوئی صحیح تنقید، بس اپنے پیشرؤوں اور زیادہ تر ''یورپی محسنین'' کے علمی سرمائے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، احادیث صحیحہ کے متعلق شکوک وشبہات ڈالنا ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے جسے وہ تاریخی حقائق، داخلی وخارجی شہادت اور خدا جانے کن کن حسین ناموں سے موسوم کرتے ہیں؟

انکارِ حدیث کے سنگین نتائج

انکارِ حدیث کی صورت میں قرآن اور اسلام کے بنیادی اصولوں میں یہیں سے تحریف تک نوبت پہنچ جاتی ہے، سنت رسول کو چھوڑنے کے بعد قرآن

کا دامن تھامنا ناممکن ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے احادیث کی اہمیت کا انکار کیا ہے انہوں نے قرآن اور اسلام کے بنیادی تصورات پر بھی ہاتھ صاف کیے ہیں۔ عصر حاضر میں فتنۂ انکارِ حدیث کے سرخیل چودھری غلام احمد پرویز صاحب نے قرآن مجید کو جس طرح اپنے ظلم و ستم کے لئے تختہ مشق بنایا ہے اس کا اندازہ حسبِ ذیل اقتباسات سے لگایا جا سکتا ہے۔

☆ ''اللہ اور رسول کا تصور: اللہ و رسول سے مراد مرکزِ ملت ہے اور اولی الامر سے مفہوم افسرانِ ماتحت''[1]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

☆ ''رسول اللہ کے بعد خلیفۃ الرسول، رسول اللہ کی جگہ لے لیتا ہے اور اب خدا اور رسول کی اطاعت سے مراد اس جدید مرکزِ ملت کی اطاعت ہے''[2]

ذات باری تعالیٰ کے بارے میں ان کے حقائق و معارف سنئے:

☆ ''اور چونکہ خدا عبارت ہے ان صفاتِ عالیہ سے جنہیں انسان اپنے اندر منعکس کرنا چاہتا ہے اس لئے قانونِ خداوندی کی اطاعت درحقیقت انسان کی اپنی فطرتِ عالیہ کے نوامیس کی اطاعت ہے''۔[3]

جنت و جہنم کے بارے میں جمہور اہل اسلام سے ہٹ کر انہوں نے یہ تصور پیش کیا ہے۔

---

[1] معارف القرآن، ج ۴ ص ۶۲۵۔ [2] ایضاً ج ۴: ص ۶۸۶۔ [3] ایضاً ج ۴: ص ۴۲۰۔

☆ ’’بہرحال مرنے کے بعد جنت وجہنم مقامات نہیں، انسانی ذات کی کیفیات ہیں‘‘۔[۱]

نماز کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

☆ ’’عجم میں پارسیوں (مجوسیوں) کے یہاں پرستش کی رسم کو نماز کہا جاتا ہے‘‘۔[۲]

☆ ’’یہ لفظ اُنہی کا ہے اور ان کی کتابوں میں موجود ہے لہٰذا ’’صلوٰۃ‘‘ کی جگہ نماز نے لے لی اور قرآن کی اصطلاح ’’اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ‘‘ کا ترجمہ ہو گیا ’’نماز پڑھو‘‘ چنانچہ اب حالت یہ ہو گئی ہے کہ ’’اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ‘‘ سے ذہن نماز پڑھنے کے علاوہ کسی اور طرف منتقل ہی نہیں ہوتا۔[۳] لیکن غور کیجئے کہ قرآنِ حکیم نے نماز پڑھنے کے لئے نہیں کہا، قیامِ صلوٰۃ یعنی نماز کے نظام کے قیام کا حکم دیا ہے وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ اور اپنے آپ کو قانونِ خداوندی کی حفاظت میں لے آؤ، مرکزِ ملت کو ان میں (جزئیاتِ نماز میں) تغیر وتبدل کا حق ہوگا‘‘۔[۴]

زکوٰۃ کے بارے میں پرویز صاحب لکھتے ہیں:

☆ ’’زکوٰۃ ٹیکس کے علاوہ کچھ نہیں، جو اس کی اسلامی حکومت مسلمانوں پر عائد کرے، اس ٹیکس کی کوئی شرح متعین نہیں کی گئی اس لئے شرحِ ٹیکس کا انحصار ضروریاتِ ملی پر ہے حتیٰ کہ ہنگامی صورتوں میں وہ سب

---

[۱] لغات القرآن، ج ۱، ص ۳۲۸۔ [۲] قرآنی فیصلے ص ۱۱۔ [۳] ایضاً ص ۲۶، ۲۷۔

[۴] طلوع اسلام شمارہ جون ۱۹۵۰ء، ص ۲۷۔

کچھ وصول کر سکتی ہے جو کسی کی ضرورت سے زائد ہو لہٰذا جب کسی جگہ اسلامی حکومت نہ ہو تو پھر زکوٰۃ بھی باقی نہیں رہتی"۔ [۱]

ختمِ نبوت کے بارے میں ان کی رائے ملاحظہ ہو:

"ختمِ نبوت کا مطلب یہ ہے کہ اب دنیا میں انقلاب شخصیتوں کے ہاتھ میں نہیں بلکہ تصورات کے ذریعے رونما ہوا کرے گا اور انسانی معاشرہ کی باگ ڈور اشخاص کے بجائے نظام کے ہاتھ میں ہوا کرے گی"۔ [۲]

غور کا مقام ہے کہ یہ ختمِ نبوت کے جیسے بنیادی عقیدے کے ساتھ مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟

معراج جیسے عظیم ترین معجزہ کا انکار اور قرآنی آیت کی تحریفِ معنوی کس طرح کی ہے اس کا اندازہ حسبِ ذیل حوالہ سے لگائیے:

☆ (آیتِ قرآنی سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ کے متعلق لکھا ہے) "خیال ہے کہ یہ واقعہ خواب کا نہیں تو یہ حضور کا شبِ ہجرت کا بیان ہے، اس طرح مسجدِ اقصیٰ سے مراد وہ مسجد ہے جسے آپ نے وہاں جا کر تعمیر کرایا"۔ [۳]

ہم نے مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر چند مختصر اقتباسات پیش کر دیئے ہیں، ان سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ انکارِ سنت کی کڑی کہاں جا کر ملتی ہے اور انکارِ سنت کے نتیجے میں اسلام کے بنیادی عقائد اور ارکانِ دین پر کس طرح ہاتھ صاف کیا جاتا ہے۔

---

[۱] قرآنی فیصلے، ص ۳۵، ۳۷۔ [۲] سلیم کے خطوط۔ [۳] معارف، ج ۴، ص ۳۶۷۔

فتنہء انکارِ سنت کو پھیلانے کے عام حربے

سنت کے خلاف حال کے منکرین سنت کی مہم جن مختلف مراحل میں جاری ہے ہم اس مختصر سے مضمون میں اس پوری مہم کا تفصیلی جائزہ تو نہیں لے سکتے تاہم اجمالاً کچھ کہہ دیتے ہیں، منکرین سنت کے حربے یہ ہیں:

(۱) احادیث کو مشکوک ثابت کرنے کے لئے مستشرقین نے جو کچھ کام اب تک کیا ہے اسے انتہائی خوش اسلوبی کے ساتھ اردو میں ڈھال کر ذہنوں میں طرح طرح کے شکوک وشبہات پیدا کرنا، مستشرقین کو بے لاگ ناقد اور غیر متعصب محقق قرار دیتے ہوئے سنت کے متعلق ان کے نظریات کو مبنی بر تحقیق قرار دینا اور الفاظ کے ہیر پھیر کے ساتھ بار بار انہی نظریات کی اشاعت کرنا۔

(۲) احادیث کے مجموعوں کو محض عیب جوئی اور نکتہ چینی کی نظر سے کھنگالنا بالکل اسی انداز میں جس میں عیسائیوں نے قرآن کو کھنگالنے کی کوشش کی تھی، پھر ان مجموعوں سے چند ضعیف اور غیر مستند روایات کو لے کر شور مچا دینا کہ احادیث کے سب مجموعے ہی ایسے ہیں۔

(۳) ایسی باتیں جو عام انسانی عقل کی سطح سے بلند ہیں لیکن بعض احادیث میں ان کا ذکر موجود ہے، ان کی تشہیر کرنا اور یہ تأثر دینا کہ تمام احادیث عقل ودانش کے تقاضوں سے ہٹی ہوئی ہیں۔ [۱]

---

[۱] تفصیل کیلئے دیکھئے ترجمان القرآن کا منصب رسالت نمبر۔

(۴) رسولِ اکرم ﷺ کے منصب کو معاذ اللہ، محض ایک پیغام رساں اور ڈاکیے کا منصب دے کر صرف الفاظِ قرآن پر زور دینا اور سنت کی اہمیت کو ختم کرنے کی مذموم کوشش کرنا۔

(۵) صرف قرآن مجید کے مأخذِ قانون ہونے پر زور دینا اور یہ کہنا کہ جب قرآن میں ہر چیز کا بیان موجود ہے تو پھر سنت کی حاجت ہی کیا ہے؟ اسی طرح جامعیتِ قرآن کی آڑ میں سنت کی آئینی حیثیت کا انکار کرنا۔

(۶) بڑے بڑے ائمہ کرام اور محدثین عظام کے بارے میں اس قسم کی غلط فہمیاں پھیلانا کہ انہوں نے خود ساختہ روایات کو فروغ دینے کے لئے مل کر سازش کر رکھی تھی، نیز اربابِ اقتدار کو خوش کرنے کے لئے ان کے حسبِ منشا احادیث وضع کرنا (معاذ اللہ) ان کا محبوب مشغلہ تھا۔

(۷) اب بعض یار لوگوں نے کافی سوچ بچار کے بعد اپنی مقصد بر آری کے لئے یہ کہنا بھی شروع کر دیا ہے کہ حالاتِ زمانہ کے مطابق سنت کی نت نئی تعبیر کی جاسکتی ہے اور حاکمِ وقت کو مشورہ سے سنت میں ترمیم کا حق پہنچتا ہے لیکن یہ ترمیم و تنسیخ سنت سے جداگانہ کوئی چیز نہیں بلکہ سنتِ جاریہ بھی ہے جس پر صحابہ کے دور سے عمل ہوتا چلا آیا ہے اور بڑے بڑے فقہاء و مجتہدین نے بھی ایسا ہی کیا ہے لہٰذا اب سنت میں ترمیم و تنسیخ کا دروازہ بند کرنا گویا سنت کے ارتقاءٔ کو روکنا اور اس میں حرکت و نمو کے بجائے جمود پیدا کرنا ہے۔ اقرارِ سنت کے رنگ میں انکارِ سنت کی یہ وہ بدترین شکل ہے جسے آج کل

بعض بڑے بڑے نام نہاد دانشور قوم کے سامنے تحقیق اور ریسرچ کے نام سے پیش کرنے میں مصروف ہیں۔

زیرِ نظر مقالہ

یہ مقالہ اپنی علمی بے بضاعتی کے باوجود سنت کی اہمیت وعظمت کو ذہن نشین کرانے کے لئے لکھا گیا ہے۔ اس مقالے کی تیاری کے لئے ان حضرات کے نظریات کو بھی بڑے غور سے پڑھا گیا ہے جو سنتِ رسول ﷺ کے خلاف اپنی مہم میں پوری طرح مصروف ہیں اور پھر جن حضرات نے اس فتنے کو روکنے کے لئے قلم اٹھایا ہے انکی تحریرات کا بھی پوری توجہ سے مطالعہ کیا گیا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ سننِ نبویہ کے اصل ذخائر، تاریخی وسیرت کی مستند کتب اور اصولِ فقہ واصولِ حدیث کے ان علمی شاہکاروں سے بھی پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے جن سے اس موضوع میں مدد مل سکتی ہے نیز اپنی طرف سے دیانتداری کے ساتھ کوشش کی ہے کہ اختصار کے ساتھ ان شکوک وشبہات کا ازالہ کیا جائے جو سنت کی شرعی حیثیت کے سمجھنے میں بعض حضرات کو لاحق ہوئے ہیں۔ ابتداءً سنت کا مفہوم واضح کرنے کی کوشش کی ہے، پھر کتاب اللہ کی روشنی میں سنت کا مقام مختصر پیرائے میں بیان کیا ہے، بعد میں سنت کی ہر دو تشریحی وتشریعی حیثیتوں پر تفصیلی بحث کی

ہے، اس ضمن میں فہم قرآن کے لئے سنت کی ضرورت واہمیت کو مختلف مثالوں سے سمجھانے کی بھی کوشش کی ہے۔

چونکہ بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ رسولِ اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین کی نظر میں سنت کا وہ مقام نہیں تھا جو بعد میں علماءِ کرام نے بیان کیا ہے اس لئے مستند تاریخی کتابوں اور احادیث کے مجموعوں سے اس سوال کو بھی حل کرنے کی کوشش کی ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ اور خلفاءِ راشدین کی نظر میں سنت کا مقام کیا تھا۔

آخر میں سنت کے مختلف اقسام اور ان کی اصولی حیثیت پر بھی اصولِ فقہ اور اصولِ حدیث کی روشنی میں مختصر بحث کی ہے۔

یہ ہماری پہلی کوشش اور منزل کی طرف پہلا قدم ہے، خداوند کریم سے دعا ہے کہ وہ اسے اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور ہماری لغزشوں کو معاف فرمائے، وَعَلَى اللّٰهِ التَّوَكُّلُ وَهُوَ الْمُسْتَعَانُ۔

احقر الانام مشتاق احمد چشتی عفی عنہ

خادم شعبۂ حدیث جامعہ غوثیہ گولڑہ شریف

سنت کا مفہوم

سنت کا لفظ لغت میں صورت، سیرت، نہج اور طریقہ کے معانی میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ علامہ مرتضیٰ زبیدی لکھتے ہیں:

اَلسُّنَّةُ اَلسِّیْرَةُ وَمِنْهُ الْحَدِیْثُ فَقَامَ رَجُلٌ قَبِیْحُ السُّنَّةِ اَیِ الصُّوْرَةِ الخ۔[1]

اسی طرح علامہ جوہری صحاح میں لکھتے ہیں:

اَلسُّنَّةُ اَلسِّیْرَةُ قَالَ الْهِنْدِیُ (خَالِدْ بْنُ وَلِیْدِ)

فلا تجز عن سیرة انت سیرتها فاول راض سنة من یسیرها[2]

علامہ ابن منظور افریقی نے فعل سَنَّ کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

سَنَّ الشَّیْئَ یَسُنُّهٗ سَنًّا فَهُوَ مَسْنُوْنٌ وَّسَنِیْنٌ وَسَنَّنَهٗ اَحَدَّهٗ وَصَقَّلَهٗ وَسَنَّ اللّٰهُ سُنَّةً اَیْ بَیَّنَ طَرِیْقاً قَوِیْمًا۔[3]

علمائے لغت کی ان تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ لفظِ سنت، صورت اور سیرت دونوں معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ فعل سَنَّ کا اسنا جب خدا تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کے معنیٰ ہیں صحیح راہ مقرر کرنا۔

علامہ راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ سنّتُ اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کا طریقِ حکمت اور قانون ہے ارشادِ خداوندی وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰ

---

[1] تاج العروس، ج۹: ص۳۳۳۔ [2] صحاح جوہری، ج۵: ص۲۱۳۹۔ [3] لسان العرب ۱۳: ص۲۷

تَبۡدِیۡلًا کا مفہوم ان کے نزدیک یہ ہے کہ اصل قانونِ الٰہی میں کوئی تبدیلی نہیں گو شرعی احکام کی صورتیں مختلف انبیاء کرام کے زمانوں میں بدلتی رہی ہیں لیکن ان کا اصل مقصود یعنی تزکیہ باطن اور قربِ الٰہی کا حصول ہمیشہ سے ایک چلا آتا ہے۔[1]

علامہ شیخ محمد طاہر نے مجمع بحار الانوار میں سنت کا لغوی و شرعی مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

اَلسُّنَّةُ فِی الۡاَصۡلِ اَلطَّرِیۡقَةُ وَالسِّیۡرَةُ وَفِی الشَّرۡعِ یُرَادُ بِهَا مَاۤ اَمَرَ بِهِ النَّبِیُّ ﷺ وَنَهٰی عَنۡهُ وَنَدِبَ اِلَیۡهِ قَوۡلًا وَفِعۡلًا مِمَّا لَمۡ یَأۡتِ بِهِ الۡکِتَابُ الۡعَزِیۡزُ.[2]

سنت اصل میں طریقہ و سیرت کا نام ہے، شریعت میں اس سے مراد وہ امور ہیں جن کی صراحت قرآنِ مجید میں نہیں مگر رسولِ خدا ﷺ نے اپنے قول و فعل سے ان کا حکم دیا ہے یا ان سے منع کیا ہے یا انہیں مندوب قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر یوئن بل نے حدیث و سنت کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اصل میں حدیث بمعنٰی روایت و حکایت ہے عام اس سے کہ وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی لیکن اس کا خاص مفہوم پیغمبرِ اسلام ﷺ اور ان کے صحابہ کرام کے اقوال و افعال کے بیان کے لئے مخصوص ہے، مؤخر الذکر مفہوم کے اعتبار سے مسلمانوں کی تمام مقدس روایات کو حدیث اور ان کے متعلقہ

---

[1] مفردات القرآن، ۲۲۵۔

[2] مجمع بحار الانوار، ج ۲: ص ۱۲۵۔

فن کو علم الحدیث کہا جاتا ہے"۔

لفظِ سنت اس راہ کیلئے بولا جاتا ہے جس پر کوئی چلنے کا عادی ہو لیکن اسلام میں غیر مسلم آباء کے رسم ورواج اپنانے پر سنت کا اطلاق نہیں کیا جاتا، مسلمانوں کے ہاں سنت کا ایک نیا مفہوم ہے جس کی رو سے ہر مومن کے لئے ضروری ہے کہ وہ پیغمبر اسلام اور ان کے صحابہ کے طرزِ عمل کو اپنی زندگی کے تمام معاملات میں نمونہ بنائے، اسی لئے سنتِ رسول کے متعلق تمام معلومات کو محفوظ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی تھی۔

آخری جملہ خاص طور پر قابل غور ہے جس میں حفاظتِ سنت کا اعتراف ایک غیر مسلم مفکر کر رہا ہے اس کے اصل الفاظ یہ ہیں:

AND EVERY ENDEAVOUR WAS MADE TO PRESERV INFORMATION REGARDING IT. ([۱] شارٹر انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ص ۱۱۶)

سنت کے اصطلاحی معانی

لفظِ سنت اصطلاحی طور پر مختلف معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے ان میں حسب ذیل تین معانی زیادہ مستعمل اور مشہور ہیں:

(۱) سنت بمقابلہ بدعت، اس معنٰی کی رو سے سنت اس طریق کار کا

---

[۱] شارٹر انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، ص ۱۱۶۔

نام ہے جسے حضور ﷺ نے رائج فرمایا اور جو حضور ﷺ کی بتائی ہوئی راہ سے منحرف نہیں، چاہے اس طریق کار کا ثبوت قرآنِ مجید سے ہو یا حدیث رسولِ خدا ﷺ سے یا خلفائے راشدین کے طریقے سے، جو طریقِ کار اس کے منافی ہوگا وہ بدعت کہلائے گا۔

جامع ترمذی، سنن ابی داؤد اور سنن ابن ماجہ میں حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ حدیث باختلافِ الفاظ مروی ہے:

فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ تَمَسَّكُوْا بِهَا وَعَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُوْرِ فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ۔ ۱؎

”تم میری سنت اور میرے خلفائے راشدین کی سنت کو اپنائے رکھو اور انہیں مضبوطی سے اپنے دانتوں کے نیچے دبائے رہو (پختگی سے عمل پیرا رہو) اور اپنے آپ کو نئے امور سے بچائے رہو کیونکہ ہر اختراع شدہ بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے“۔

اس حدیث سے کچھ حضرات نے بدعت کا وسیع مفہوم نکالا ہے، اس وقت ہمارے پیش نظر بدعت کی بحث نہیں لیکن بنا بر مناسبت امام شافعی کا ایک قول پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جسے امامِ نووی نے امام بیہقی کے

۱؎ سنن ترمذی، ج ۲، ص ۹۷۔ سنن ابی داؤد، ج ۲: ۲۶۱۔ سنن ابن ماجہ، ج ۱، ص ۱۹۔

حوالے سے نقل کیا ہے، یہ قول بدعت کے بارے میں بہت سے شبہات کا ازالہ کر دینے کے لئے کافی ہے، امام محی الدین نووی لکھتے ہیں:

وَرَوَى الْبَيْهَقِيُّ بِإِسْنَادِهٖ فِيْ مَنَاقِبِ الشَّافِعِيِّ عَنِ الشَّافِعِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ اَلْمُحْدَثَاتُ مِنَ الْاُمُوْرِ ضَرْبَانِ اَحَدُهُمَا مَا اُحْدِثَ مِمَّا يُخَالِفُ كِتَابًا اَوْ سُنَّةً اَوْ اَثَرًا اَوْ اِجْمَاعًا فَهٰذِهِ الْبِدْعَةُ الضَّلَالَةُ وَالثَّانِيَةُ مَا اُحْدِثَ مِنَ الْخَيْرِ لَا خِلَافَ لِوَاحِدٍ مِّنَ الْعُلَمَاءِ وَهٰذِهٖ مُحْدَثَةٌ غَيْرُ مَذْمُوْمَةٍ۔[1]

”امام بیہقی نے اپنی سند کے ساتھ مناقب الشافعی میں حضرت امامِ شافعی سے روایت کیا ہے کہ محدثاتِ امور کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو کتاب و سنت، آثارِ صحابہ اور اجماع کے خلاف ہو، یہ بدعتِ ضلالت ہے اور دوسرے وہ امور محدثہ جو امورِ خیر سے ہوں، ان میں علماءِ حق کا کوئی اختلاف نہیں اور یہ امورِ محدثہ غیر مذموم ہیں“۔

غرضیکہ جب لفظِ بدعت سنت کے مقابلے میں بولا جائے گا تو اس سے بدعتِ ضلالت ہی مراد ہوگی، سنت کے اس مفہوم کے اعتبار سے سوادِ اعظم کو اہلسنت کہا جاتا ہے۔ محدثین کے ایک خاص طبقے نے ان نصوص کو جو متشابہ سمجھی جاتی ہیں اپنے صحیح مفہوم پر رکھنا سنت اور ان میں کجروی سے کام

---

[1] تہذیب الاسماء واللغات، ج۲: ص۲۲۔

لیتے ہوئے غلط تاویلیں نکالنے کو بدعت قرار دیا ہے، امامِ بخاری نے صحیح بخاری میں اسی اصول کے پیشِ نظر کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ کا عنوان قائم کیا ہے، اسی طرح امامِ ابوداؤد سجستانی نے کتاب السنہ کا عنوان قائم کیا ہے اور علامہ شاطبی نے تو الاعتصام کے نام سے مستقل کتاب لکھ دی ہے۔

غرضیکہ محدثین اور متکلمین کے نزدیک سنت کا یہ استعمال کافی شہرت رکھتا ہے۔

۲-سنت کا فقہی مفہوم: سنت کا لفظ فقہاءِ کرام کی اصطلاح میں ان مستحسن امور کے لئے بولا جاتا ہے جن پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مداومت فرمائی ہو لیکن کبھی کبھی ترک بھی کر دیا ہو۔[1] پھر سنت کی بھی دو قسمیں ہیں، سنن ہدیٰ اور سُنن زوائد، ان میں سے ہر ایک کے تفصیلی احکام کتبِ فقہ میں موجود ہیں۔

۳-سنت کا اصولی مفہوم: علمائے اصول فقہ کی اصطلاح میں سنت کا اطلاق رسولِ اللہ ﷺ کے اقوال وافعال اور تقریرات، سب پر ہوتا ہے۔ چنانچہ علامہ کمال الدین ابن ہمام فرماتے ہیں:

وَفِی اصْطِلَاحِ الْاُصُوْلِ قَوْلُہٗ عَلَیْہِ السَّلَامُ وَ فِعْلُہٗ وَتَقْرِیْرُہٗ.[2]

"علمائے اصول کی اصطلاح میں سنت رسول اللہ ﷺ کے قول، فعل اور تقریر کا نام ہے۔"

---

[1] فتح القدیر، ج ۲: ص ۱۳۔

[2] تحریر الاصول، ج ۲: ص ۲۲۳۔

سنتِ قولی کا اطلاق آپ کے ارشادات پر کیا جاتا ہے چاہے وہ حدیثِ متواتر کی صورت میں ہو یا خبرِ واحد کی شکل میں۔ ان پر تفصیلی بحث انشاءاللہ اس مقالے کے آخر میں کی جائے گی۔

سنتِ فعلی میں تفصیل [1] ہے، علمائے اصول نے کہا ہے کہ اگر کسی فعل کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ آپ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے تو اس پر افرادِ امت کو عمل کرنے کی اجازت نہیں مثلاً نیند سے وضو کا نہ ٹوٹنا ، چار سے زیادہ بیویاں حلال ہونا وغیرہ۔ اگر وہ فعل خصائص سے نہ ہو تو اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں، یا تو وہ افعالِ عادیہ طبعیہ سے ہوگا جیسے کھانا پینا اور لباس پہننا، یہ افعال طبعیہ واجب الاتباع نہیں، تاہم ان میں ادائے نبوت کی پیروی کی وجہ سے ثواب ضرور ملتا ہے، یہ افعالِ طبعیہ کی پیروی تھی کہ رسولِ خدا ﷺ نے دورانِ سفر جہاں قیام فرمایا اونٹنی بٹھائی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی جذبہء اتباع میں ویسے ہی کیا کرتے تھے، اسی جذبہء محبت کی بنا پر حضرت بایزید بسطامی نے عمر بھر خربوزہ نہیں کھایا کیونکہ انہیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ حضور رحمتِ دو عالم ﷺ نے اسے کس طرح استعمال فرمایا ہے؟

علامہ اقبال نے اسی جذبہ محبت سے سرشار ہو کر یہ اشعار کہے۔

---

[1] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو اصول الفقہ خضری، ص ۲۹۴۔ ایضاً بحث افعال اصول بزدوی، ص ۲۲۸۔

عاشقی محکم شو از تقلیدِ یار   تا کمندِ تو شود یزداں شکار
کامل بسطام در تقلیدِ فرد   اجتناب از خوردنِ خربوزہ کرد

اگر افعالِ عادیہ سے نہ ہو بلکہ کتاب اللہ کے کسی مجمل حکم کا بیان ہو مثلاً اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کے بیان کے طور پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرما دینا صَلُّوْا کَمَا رَأَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ (تم نماز پڑھو جیسا کہ مجھے پڑھتا ہوا دیکھ رہے ہو)۔ ایسی صورت میں بیانِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وہی حیثیت ہوگی جو اصل حکمِ منصوص کی ہے۔ اگر اس کا بیان ہونا معلوم نہ ہو سکے مگر کوئی صفتِ وجوب یا استحباب وغیرہ معلوم ہو جائے تو اسی حیثیت کے مطابق عمل کیا جائے گا، اگر اس کی کوئی صفت معلوم نہ ہو سکے تو اگر وہ افعالِ قرب سے ہو جیسے وہ دوگانہ جس پر مواظبت نہیں، تو وہ مندوب ہے ورنہ مختلف فیہ ہے، امام مالک کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور امت، دونوں کے حق میں اسے واجب قرار دیا جائے گا، احناف کی ایک جماعت نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں مباح اور امت کیلئے اس کا اتباع ضروری قرار دیا ہے تاوقتیکہ کوئی دلیل وجوب کے خلاف قائم نہ ہو جائے کہ اس صورت میں اسی دلیل پر عمل کیا جائے گا۔

سنتِ تقریری یہ ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کسی صحابی نے کوئی کام کیا ہو یا اس کے کام کی اطلاع رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

تک پہنچی ہو اور آپ نے اس پر سکوت فرمایا ہو، منع نہ کیا ہو تو یہ اس کام کے مباح ہونے کی دلیل ہے، اگر وجوب یا استحباب کی دلیل مل جائے تو درست ورنہ اسے کم از کم مباح ضرور سمجھا جائے گا۔[1]

سنت کا یہی اصولی مفہوم (قول و فعل و تقریر رسول ﷺ) ہماری بحث کا موضوع ہے، اسے ہم کتاب اللہ کے علاوہ مستقل حجتِ شرعیہ کی حیثیت سے مانتے ہیں، جب کتاب و سنت کی اصطلاح بولی جاتی ہے تو اس سے سنت کا مذکورہ بالا معنٰی ہی مراد ہوتا ہے۔ سنت کا یہ مفہوم بالکل واضح ہے، ہر عقلمند آدمی سمجھ سکتا ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے تیئس سالہ دورِ بعثت میں جو کچھ کیا وہ رسولِ مطاع ہونے کی حیثیت سے ہمارے سامنے ہے، سنت کی یہ اصطلاح اگرچہ علماءِ اصول کی طرف منسوب ہے لیکن حقیقتِ نفس الامری کے اعتبار سے دیکھا جائے تو کتاب و سنت کا یہ تصور خود رسولِ پاک ﷺ نے عطا فرمایا جیسا کہ مؤطا امام مالک کی حدیث ہے:

تَرَكْتُ فِيْكُمْ اَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّةُ رَسُوْلِهٖ۔[2]

”میں تم میں دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں، اگر تم انہیں مضبوطی سے تھامے رہو گے تو گمراہ نہ ہو گے، یہ کتاب و سنت ہیں“۔

اسی طرح صحیح مسلم میں امانت کا ذکر کرتے ہوئے ایک حدیث

---

[1] اصول الفقہ خضری، ص ۲۹۶۔

[2] مؤطا امام مالک

مرفوع میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الْاَمَانَةَ نَزَلَتْ فِیْ جَذْرِ قُلُوْبِ الرِّجَالِ ثُمَّ نَزَلَ الْقُرْاٰنُ فَعَلِمُوْا مِنَ الْقُرْاٰنِ وَعَلِمُوْا مِنَ السُّنَّةِ۔[1]

"امانت لوگوں کے دلوں کی جڑ میں اتری، پھر قرآن نازل ہوا تو لوگوں نے قرآن سے اس کا علم حاصل کیا اور پھر سنت سے اس کا علم حاصل کیا"۔

اسی طرح صحابہ کرام سے کثرت کے ساتھ مروی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے اقوال وافعال کو سنت سے تعبیر کرتے تھے اور انہیں کسی حیل وحجت کے بغیر دلیلِ شرعی تسلیم کرتے تھے لہٰذا یہ کہنا کہ سنت کی یہ اصطلاح بعد کی پیداوار ہے حقائق سے کھلم کھلا انکار نہیں تو اور کیا ہے؟

عصرِ حاضر کے کچھ محققین سنت کے مفہوم میں وسعت پیدا کرنے کے لئے مسلمانوں کے تعامل، سیاسی حکمرانوں کے فیصلوں اور اجتہادی مسئلوں پر بھی بے دریغ سنت کا اطلاق کرتے ہیں اور علماءِ حق کو، جو سنتِ نبوی کے محافظ ہیں، جمود، تنگ نظری اور تقلیدِ آباء کا الزام دیتے ہیں حالانکہ یہ نام نہاد محقق خود تقلیدِ مغرب میں اس قدر سرشار ہیں کہ مستشرقین یورپ بالخصوص اسنوک، پرخرونئے، طلونز اور مرجی لیوث کے فاسد نظریات کو اپنانے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے چنانچہ ان مستشرقین کا خیال ہے کہ سنت

---

[1] صحیح مسلم، ج ۱، ص ۸۲۔

رسول کا تصور بعد کی پیداوار ہے نیز یہ کہ مسلمانوں نے بھی اپنے نبی کی سنت میں اپنی طرف سے اضافہ کیا اسی طرح یہ تجدد پسند محقق بھی فرماتے ہیں کہ عہدِ رسالت کے بعد سنت کا صحیح مفہوم صرف یہی نہیں تھا کہ اس سے مراد آنحضرت ﷺ کی سنت ہو بلکہ سنتِ نبوی کی جو توضیح کی جاتی تھی وہ بھی سنت سمجھی جاتی تھی۔[1]

قدرۃً ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ حضرات سنت کے دائرے کو اس قدر وسیع کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں، آخر انہیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ سنت کے سیدھے سادے مفہوم کو اپنی ریسرچ کا نشانہ بنا کر چیستاں بنا دیا ہے؟ اس سوال کا جواب چنداں دشوار نہیں بشرطیکہ ان کے لٹریچر کا مختصر جائزہ لے لیا جائے اور ان کے فکر و نظر کی گہرائی سے آگاہی حاصل کر لی جائے، اصل بات یہ ہے کہ یہ حضرات اسلام کو عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں یہ قرآن و حدیث کی ایسی تعبیر اور ترجمانی کرنا چاہتے ہیں جو لفظی طور پر خوش آئند ہے مگر معنوی طور پر اس میں الحاد کے زہر کو پوری طرح بھر دیا گیا ہے، ان کی سر توڑ کوشش یہی ہے کہ سنت رسول ﷺ کی ایک متعین اور متفق علیہ حیثیت کو ختم کیا جائے تا کہ اس کے بعد قرآن کی من مانی تفسیر اور تشریح میں کوئی دقت نہ رہے، چونکہ انہیں نظر آ چکا

---

[1] ماہنامہ فکر و نظر، شمارہ جولائی ۱۹۶۳ء۔

ہے کہ صراحتاً انکارِ سنت کا نظریہ امت میں پذیرائی حاصل نہیں کرسکتا، اس لئے وہ واضح الفاظ میں انکارِ سنت کی جرأت تو نہیں کرتے مگر سنت کی حقیقت کو مسخ کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں وہ ملتِ اسلامیہ کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ:

’’احادیث کے مختلف عناصرِ ترکیبی کی از سرِ نو جانچ پڑتال اور آج کل کے بدلے ہوئے اخلاقی اور معاشرتی ماحول کے پس منظر میں ان کی تعبیرِ نو ضروری ہے‘‘۔[1]

وہ فقہاء کے نظریہ سنت کو جامدانہ اور بے لچک عقیدہ قرار دے کر سنت کا ایک متحرک اور لچکدار نظریہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔

اہل علم حضرات کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس الحاد کے خطرناک مضمرات پر کڑی نظر رکھیں، سنت کا یہ ارتقائی تصور بالکل غیر اسلامی ذہن کی پیداوار ہے، کتاب وسنت، اجماعِ امت اور امت کی چودہ سو سالہ تاریخ میں کہیں بھی یہ نظریہ سنت دکھائی نہیں دیتا، ہم زیادہ تفصیل میں جانا مناسب نہیں سمجھتے، سنت کے لغوی واصطلاحی مفہوم کو تحریر کرنے کے بعد ضروری سمجھتے ہیں کہ کتاب اللہ کی روشنی میں سنت کا مقام بیان کیا جائے، کتاب وسنت کا باہمی ربط وتعلق واضح کیا جائے اور سنت کی اہمیت وعظمت کو حقائق کی روشنی میں پیش کیا جائے۔

---

[1] ماہنامہ فکر ونظر شمارہ جنوری ۱۹۶۳ء۔

قرآن میں سنت کی اہمیت

منصبِ رسالت

سنت کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ قرآنِ مجید کی روشنی میں صاحبِ سنت ﷺ کے منصب اور مقام کو سمجھنے کی کوشش کی جائے، اگر رسول کی حیثیت صرف ایک مبلغ اور پیغام رساں کی ہو تو ظاہر ہے کہ پیغام رسانی کے علاوہ اس کے فرمودات کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی چنانچہ بعض لوگوں کو یہی دھوکا ہوا ہے قرآنِ کریم میں پیغمبر برحق ﷺ سے خطاب کر کے فرمایا ہے کہ آپ کے ذمہ صرف پہنچا دینا ہے لہٰذا تبلیغ آیات کے بعد رسولِ خدا ﷺ کی ذمہ داری ختم ہوگئی، اب امت جانے اور قرآن، لہٰذا سنت کی اتباع کا کوئی تصور ہی یہاں نہیں پایا جاتا مگر رسالت کا یہ تصور عقل و نقل کی روشنی میں بالکل غلط قرار پاتا ہے اس لئے کہ ہر ذی شعور آدمی سمجھ سکتا ہے کہ اگر محض کتاب کا بھیجنا مقصود ہوتا تو انبیاء کرام کو واسطہ بنانے کی کیا ضرورت تھی، آسمان سے کتاب نازل ہو جاتی جس میں ترتیب وار تمام ہدایات اور عملی زندگی کے مسائل درج ہوتے مگر ایسا نہیں کیا گیا بلکہ رب تعالیٰ نے کمالِ حکمت کے ساتھ ان نفوسِ قدسیہ کو منتخب کیا جن کے سینے اس عظیم امانت کے متحمل ہو سکتے تھے جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے:

اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ (سورۃ الانعام ایۃ نمبر ۱۲۴)

"اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت کہاں رکھے"۔

ان نفوسِ قدسیہ سے صرف یہی کام نہیں لیا گیا کہ وہ کتاب پہنچا دیں بلکہ یہ بھی کہ نفوسِ امت کا تزکیہ کریں اور کتاب وحکمت کی تعلیم دیں۔ قرآن کریم پر غور کرنے سے رسولِ کریم ﷺ کی مختلف حیثیتوں پر روشنی پڑتی ہے چنانچہ سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس دعا کا ذکر آتا ہے جس میں وہ بارگاہ رب العزت میں یوں عرض گزار ہیں:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِکَ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ وَیُزَکِّیْھِمْ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ. (سورۃ بقرۃ آیت ۱۲۹)

"اے ہمارے رب بھیج ان میں ایک رسول انہی میں سے کہ ان پر تیری آیتیں تلاوت فرمائے اور انہیں تیری کتاب اور پختہ علم سکھائے اور انہیں خوب ستھرا کردے، بے شک تو ہی غالب حکمت والا"۔

دعائے ابراہیمی قبول ہوئی اور اظہارِ انعام واحسان کے طور پر ارشاد فرمایا گیا:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ. (ال عمران آیۃ ۱۶۴)

”بیشک اللہ کا بڑا احسان ہوا مسلمانوں پر کہ ان میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت سکھاتا ہے اور وہ ضرور اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔“

ان آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کام صرف قرآنِ کریم پڑھ کر سنانا نہیں بلکہ کتاب وحکمت کی تعلیم اور نفوس کا تزکیہ بھی ہے جو آپ کے فرائض منصبیہ میں داخل ہے۔

یہاں پر اس وہم کا ازالہ بھی ضروری ہے کہ جن آیات میں رسول خدا ﷺ کا کام صرف تبلیغ اور ابلاغ ذکر کیا گیا ہے وہ صرف اس سلسلے میں ہے کہ اگر کفار آپ کی بات نہیں مانتے تو آپ کا کام صرف پہنچا دینا ہے، ماننا نہ ماننا ان کا فعل ہے، چنانچہ سورۂ یٰسین میں جہاں کفار کا یہ اعتراض ذکر کیا گیا ہے کہ ”اے پیغمبر! تم ہم جیسے انسان ہو، خدا نے کوئی چیز نازل نہیں کی، تم (معاذ اللہ) کذب بیانی سے کام لیتے ہو۔“ وہاں اس کے جواب میں پیغمبرانِ عظام علیہم السلام کی زبانی فرمایا گیا ہے:۔

رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّا اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ٥ وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ ٥ (سورۂ یٰسین، آیت ۱۶، ۱۷)

”ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم بے شک ضرور تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں اور ہمارے ذمہ نہیں مگر صرف پہنچا دینا۔“

یعنی ہم نے تم تک پیغامِ خداوندی پہنچا دیا ہے، اب اسے زبردستی منوانا یا دل و دماغ میں ٹھونس دینا ہمارا کام نہیں، اس کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ جو لوگ برضاء و رغبت خدا کی کتاب کو مان لیں تو انبیاء کرام انہیں کتابِ الٰہی کے معانی و مطالب نہیں سمجھاتے یا اپنے قول و فعل سے شرعی احکام کی وضاحت نہیں کرتے۔

قرآن کا مطالعہ کرنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ اس میں بار بار رسولِ خدا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اتباع اور اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور اتباع کرنے والوں کو جنت کی بشارتیں دی گئی ہیں جبکہ منکرین کو عذابِ الیم کی وعید سنائی گئی ہے چنانچہ سورۂ آلِ عمران میں ارشاد ہوتا ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (آیت ۳۱)

"اے محبوب! تم فرما دو اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میرے فرمانبردار ہو جاؤ اللہ تعالیٰ تمہیں دوست رکھے گا، تمہارے گناہ بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔"

یہاں پر مدعیانِ محبت کے لئے اتباعِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کسوٹی کے طور پر پیش کیا گیا ہے، اتباع کے معنیٰ کسی کے پیچھے پیچھے چلنے کے ہیں چنانچہ علامہ ابنِ منظور افریقی لکھتے ہیں۔

تَـقُـوْلُ اِتَّبَعْتُ الرَّجُلَ اِذَا یَسِیْرُ وَاَنْتَ تَسِیْرُ وَرَاءَ هٗ فَاِذَا قُلْتَ اِتَّبَعْتُ فَكَاَنَّكَ قَفَوْتَهٗ۔[1]

یعنی اتباع کے معنٰی کسی کے پیچھے چلنے اور کسی کی پیروی کرنے کے ہیں، علامہ راغب اصفہانی فرماتے ہیں۔

تَبِعَهٗ وَاَتْبَعَهٗ قَفَاءَ اَثَرِهٖ وَذٰلِكَ تَارَةً بِالْاِرْتِسَامِ وَالْاِئْتِمَارِ۔[2]

یعنی تَبِــعَ اور اَتْبَــعَ کے معنٰی نقشِ قدم پر چلنے کے ہیں اور تعمیلِ حکم کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

علامہ ابوالحسن آمدی فرماتے ہیں کہ متابعت کبھی قولی ہوتی ہے اور کبھی فعلی، متابعتِ قولی یہ ہے کہ قول کے مقتضٰی کے مطابق عمل کیا جائے اور متابعتِ فعلی یہ ہے کہ تاسّی (ہو بہو اقتداء) کی جائے۔ [3]

تاسّی کا جامع مفہوم علامہ کمال الدین ابن ہمام نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

اَلتَّاَسِّیُ مِثْلُ فِعْلِهٖ عَلٰی وَجْهِهٖ لِاَجْلِهٖ۔ [4]

یعنی تاسی سے مراد یہ ہے کہ کسی کی اقتداء میں اسی جیسا کام کیا جائے اور اس کی اقتداء کی نیت سے کیا جائے۔

اس سے ان لوگوں کے مغالطہ کا ازالہ ہو جاتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ

---

[1] لسان العرب، فصل التاء من باب العین۔

[2] مفردات راغب، ص ۷۱۔

[3] احکام الاحکام، ج ۱: ص ۸۹۔

[4] التحریر مع شرح تیسیر التحریر، ج ۳: ص ۱۹، ۲۰۔

اتباعِ رسول سے مراد یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے دورِ نبوت میں قرآن پر عمل کر کے دکھایا، ہم بھی قرآن پر عمل کر کے دکھائیں، حضور ﷺ نے مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ، کو دوسروں تک پہنچایا، ہم بھی پہنچائیں اور بس!

ظاہر ہے یہ ایک پُر فریب مغالطہ ہے اور اتباعِ رسول کے پردے میں سنتِ رسول کا انکار ہے۔ اتباعِ رسول کا یہ مفہوم مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ، کے تقاضوں کے بھی خلاف ہے کیونکہ کتاب اللہ میں رسولِ پاک ﷺ کو معلّم، مربّی، شارحِ قرآن، شارع اور حاکمِ شرع وغیرہ کی حیثیت میں پیش کیا گیا ہے لہٰذا ان حیثیتوں کے ساتھ رسولِ خدا ﷺ نے جو عہد کیا یعنی کتاب اللہ کے معانی کی تعلیم دی، تربیت کے اصول قائم فرمائے، قرآن کی تشریح کی، آئین سازی فرمائی اور شرعی فیصلے صادر فرمائے، یہ سب چیزیں اس وحیِ متلو سے ماسوا ہیں لہٰذا جب تک ان تمام امور میں آپ کی پیروی نہ کی جائے اور آپ کی سنت کو حجت نہ مانا جائے، اتباعِ رسول کا مفہوم پورا نہ ہوگا، بھلا سنتِ رسول کی مخالفت کرنے والا کس طرح ”فَاتَّبِعُوْنِیْ“ پر عمل پیرا ہو سکتا ہے؟

فنِ لغت کے فاضل مفسر علامہ جار اللہ زمخشری اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

فَمَنِ ادَّعٰی مَحَبَّۃً وَخَالَفَ سُنَّۃَ رَسُوْلِہٖ فَھُوَ کَذَّابٌ وَکِتَابُ اللّٰہِ یُکَذِّبُہٗ۔[1]

---

[1] تفسیر کشاف، ج ۱: ۱۲۳۔

"جو شخص خدا کی محبت کا دعویٰ کرے اور سنتِ رسول (ﷺ) کی مخالفت کرے وہ جھوٹا ہے اور خدا کی کتاب اس کی تکذیب کرتی ہے۔"

اتباعِ رسول کی دوسری دلیل

سورۂ نساء میں ارشاد ہوتا ہے:

فَلَا وَرَبِّکَ لَایُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا. (سورۃ النساء، ایت ۶۵)

"اے محبوب! تمہارے رب کی قسم، وہ مسلمان نہ ہوں گے جب تک آپس کے جھگڑوں میں تمہیں حاکم نہ بنائیں، پھر جو کچھ تم حکم فرمادو اپنے دلوں میں اس سے تنگی محسوس نہ کریں اور اسے کھلے دل سے تسلیم کرلیں۔"

ظاہر ہے یہ فیصلے سنتِ رسول علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں داخل ہیں، وحیِ متلو نہیں ہیں، چنانچہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اسی آیت کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں:

نَزَلَتْ هٰذِهِ الْاٰیَةُ فِیْمَا بَلَغَنَا وَاللّٰهُ اَعْلَمُ فِیْ رَجُلٍ خَاصَمَ الزُّبَیْرَ فِیْ اَرْضٍ فَقَضٰی بِهَا النَّبِیُّ لِلزُّبَیْرِ وَهٰذِهِ الْقَضَاءُ سُنَّةٌ مِّنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ لَاحُکْمٌ مَّنْصُوْصٌ فِی الْقُرْاٰنِ.[1]

"ہمیں جو روایت پہنچی ہے اس کی رو سے یہ آیت اس شخص کے

---

[1] الرسالۃ (للشافعی) ص ۸۲۔

بارے میں نازل ہوئی ہے جس نے ایک اراضی کے بارے میں حضرت زبیرؓ سے جھگڑا کیا تھا، رسول خدا ﷺ نے حضرت زبیرؓ[1] کے حق میں فیصلہ کیا یہ فیصلہ سنتِ رسول ﷺ میں داخل ہے نہ کہ قرآن کے حکمِ منصوص میں۔"

مذکورہ بالا آیت سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ قیامت تک رسولِ خدا ﷺ کے فیصلے حجتِ شرعیہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور انہیں عہدِ بعثت کے ساتھ مخصوص نہیں کیا جا سکتا لہٰذا اب جو حضرات رسولِ اکرم ﷺ کے فیصلوں کو وقتی فیصلے قرار دے کر ان کی اہمیت گھٹانا چاہتے ہیں وہ قرآن کے بیان کردہ اصول سے انحراف کر رہے ہیں۔

اس آیت سے اس شبہ کا ازالہ بھی ہو جاتا ہے کہ ہو سکتا ہے رسولِ خدا ﷺ بتقاضائے بشریت (معاذ اللہ) قضاءِ باطل فرما دیں تو اس کی اتباع کیونکر کی جا سکتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ رسولِ خدا ﷺ کے فیصلوں کو تسلیم کرنا، ایمان کے لئے موقوف علیہ قرار دیا گیا ہے اور ایمان کا موقوف علیہ ایسی چیز نہیں ہو سکتی جو کبھی حق ہو اور کبھی باطل، لہٰذا تمام فیصلے شرعی اصولوں کے مطابق برحق ہوں گے اور ان کے خلاف دلوں میں تنگی یا تردد محسوس کرنا بھی جائز نہیں، دنیاوی عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف تو زبان یا تحریر سے مخالفت توہینِ عدالت میں داخل ہے مگر یہاں تو اتنی

---

[1] بخاری و مسلم میں بھی اراضی سیراب کرنے کے بارے میں حضرت زبیر سے ایک انصاری کی خصومت کا ذکر موجود ہے۔

شدید پابندی ہے کہ دل میں بھی ان کے خلاف تردد یا تنگی محسوس کرنا، ایمان کے منافی قرار دیا جا رہا ہے۔

اتباع واطاعتِ رسول کی تیسری دلیل

سورۂ نساء میں رسولِ خدا ﷺ کی اطاعت کی پُر زور تاکید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

يَـاأَيُّهَـا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُوْلِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا. (سورۃ النساء، آیت ۵۹)

”اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور اہلِ امر لوگوں کا، جو تم میں سے ہوں پھر اگر کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹاؤ، یہ بہت بہتر ہے اور اس کا انجام بہت اچھا ہے۔“

اس آیت میں یہ دو باتیں خاص طور پر قابلِ غور ہیں، ایک یہ کہ خدا و رسول کے لئے حکم اطاعت مستقل طور پر ہے، اولی الامر کے لئے ایسا نہیں یعنی خدا کی کتاب اور رسولِ مقبول ﷺ کی سنت تو مستقل طور پر حجت شرعیہ ہیں، اولی الامر کی بات صرف اسی صورت میں قابل قبول ہے، جب وہ خدا اور اس

کے رسول کے حکم کے عین مطابق ہو، دوسرا یہ کہ اختلاف کی صورت میں صرف خدا اور رسول کی طرف رجوع کرنے کا حکم ہے، اولی الامر کی طرف نہیں اس لئے کہ اولی الامر کی ذات تو احکامِ خداوندی کے نافذ کرنے کے لئے ہے اور جب خود اس میں لوگوں کا نزاع ہو جائے تو اس صورت میں ان کا قول حجت نہیں ہوگا بلکہ خدا اور رسول یعنی کتاب وسنت ہی کی طرف رجوع کیا جائے گا، کتاب وسنت کی روشنی میں کسی امر کے مشروع یا غیر مشروع ہونے کا جو فیصلہ معلوم ہو گا وہ عوام کے لئے واجب الاطاعت ہوگا اور اولی الامر کے لئے بھی۔

مرکزِ ملت کا غلط تصور

اس آیت کے مفہوم پر اچھی طرح غور کر لینے کے بعد اب ان منکرینِ احادیث کے اس غلط تصور کی تردید ہو جاتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ رسول کی طرح حکام وسلاطین بھی اپنے اپنے دور میں ''مرکزِ ملت'' ہوتے ہیں لہٰذا ان حکام اور اربابِ اقتدار کی طرف رجوع درحقیقت خدا اور رسول کی طرف رجوع قرار دیا جائے گا۔ اس تصور کے زہریلے مضمرات اہل دانش سے پوشیدہ نہیں، بہرحال اگر وہ لوگ قرآن سے اپنے قلبی روابط کا دعویٰ کرتے ہیں تو انہیں دیانتداری سے فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِی شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ کے ارشاد پر ایک بار پھر غور کرنا چاہئے، کیا یہ آیت ان کے

---

[1] معارف، از پرویز صاحب، ج ۴: ۶۸۶۔

اس نام نہاد "تصورِ مرکزِ ملت" کی بیخ کنی نہیں کرتی؟

رسول خدا ﷺ کے آئینی کام پر شبہ کا ازالہ

یہ ایت ان مدعیان تحقیق کے غلط نظریے پر بھی ضرب کاری لگاتی ہے جو اپنے مغربی محسنین سے متاثر ہو کر یہ کہتے ہیں کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ صرف مصلح تھے، آپ نے آئین سازی کی طرف کم توجہ فرمائی، قرآن مجید میں رسولِ خدا ﷺ کو مصلح اعظم ہونے کے علاوہ مطاع، شارع اور حَکَمِ مطلق قرار دیا گیا ہے اور تمام اختلافی مسائل میں چاہے ان کا تعلق عبادات سے ہو یا معاملات سے قانون سازی سے ہو یا کسی اور معاملے سے، غرضیکہ تمام صورتوں میں فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ کا حکم سنایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کتاب وسنت میں ان مسائل کا حل ہی نہ ہو اور آئین سازی جیسے بنیادی کام کی طرف کم توجہ دی گئی ہو تو پھر رجوع کرنے کا کیا فائدہ ہوگا؟ اور سورۂ مائدہ میں تکمیل دین کی بشارت دینے سے کیا مقصود ہوگا؟

منصبِ رسالت کے بارے میں یہ غلط تصور، فلسفہ مغرب سے مرعوبیت کا نتیجہ ہے۔ اہل دانش بخوبی جانتے ہیں کہ کتاب وسنت میں تمام مسائل کا حل موجود ہے اور آئین سازی کے لئے یہ دونوں سرچشمے آج بھی اسی طرح نافع ہو سکتے ہیں، جیسا کہ آج سے چودہ صدیاں پہلے تھے۔

اطاعتِ رسول کی چوتھی دلیل

قرآنِ مجید نے بعثتِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مقصد بھی یہی قرار دیا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ.

(سورۃ النساء ایت ۶۴)

''ہم نے کسی کو رسول بنا کر نہیں بھیجا مگر اس لئے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن سے۔''

دوسرے مقام پر رسول کریم علیہ الصلوۃ والسلام کی اطاعت کو بعینہٖ اطاعتِ الٰہی قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

پانچویں دلیل

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (سورۃ النساء ایت ۸۰)

''جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔''

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اطاعتِ رسول کی تاکید کی گئی ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اطاعت کے مفہوم کو واضح کیا جائے، علامہ ابن منظور افریقی نے لسان العرب میں لکھا ہے۔

طَاعَ لَهٗ يَطُوْعُ اِذَا انْقَادَ لَهٗ بِغَيْرِ اَلِفٍ وَاِذَا مَضٰى لِاَمْرِهٖ

فَقَدْ اَطَاعَهٗ وَاِذَا وَافَقَهٗ فَقَدْ طَاوَعَهٗ۔[1]

یعنی اس کے مادہ مجرد کا مفہوم انقیاد ہے، اطاعت کا لفظ کسی کے امر کو پورا کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور موافقت کے لئے لفظِ مطاوعت بولا جاتا ہے۔ علامہ زبیدی فرماتے ہیں:

طَاعَ لَهٗ يَطُوْعُ اِنْقَادَ وَمِنْهُ وَقَدْ قَادَتْ فُؤَادِىْ فِىْ هَوَاهَا وَطَاعَ لَهُ الْفُؤَادُ وَمَا اَعْصَاهَا۔[2]

یعنی لفظِ طَاعَ یَطُوْعُ انقیاد کے لئے بولا جاتا ہے جب کہ شاعر نے عصیان کے مقابلے میں اسے استعمال کیا ہے۔

علامہ ابو الحسن آمدی فرماتے ہیں کہ اطاعت میں مطاع کے احترام کا تصور بھی پایا جاتا ہے چنانچہ لکھتے ہیں۔

مَنْ اَتٰى بِمِثْلِ فِعْلِ الْغَيْرِ عَلٰى قَصْدِ اِعْظَامِهٖ لَهٗ فَهُوَ مُطِيْعٌ لَهٗ۔[3]

"جو دوسرے کی طرح کام کرے اور تعظیم و احترام کی نیت سے ایسا کرے وہ مطیع کہلاتا ہے۔"

چھٹی اور ساتویں دلیل

اطاعتِ رسول ﷺ سے انحراف کرنے والوں کو قرآنِ مجید نے

---

[1] لسان العرب، فصل الطاء من باب العین۔ [2] تاج العروس، ج ۵: ۴۳۵۔ [3] احکام الاحکام، ۱: ۹۱۔

شدید عذاب سے ڈرایا ہے۔ چنانچہ سورۂ نور میں ارشاد ہوتا ہے۔

فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ○ (ایت ۶۳)

"ان لوگوں کو جو رسول کے حکم کے خلاف کرتے ہیں، ڈرنا چاہیے کہ انہیں کوئی فتنہ یا دردناک عذاب نہ پہنچے"

ایک اور مقام پر رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کرنے والوں کا عبرتناک انجام بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا (النساء ایت ۴۲)

"آج کے دن کفار اور رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کرنے والے تمنا کریں گے کہ کاش انہیں زمین میں پیوست کر دیا جاتا اور کوئی بات نہیں چھپائیں گے"۔

آٹھویں دلیل

بعض ذہنوں میں چونکہ یہ شبہ پیدا ہو سکتا تھا کہ خدا اور رسول کے فیصلے اپنی جگہ اہم سہی مگر انسان اپنی طبعی آزادی فکر کی بنا پر ان کے خلاف کرنے کا اختیار بھی رکھتا ہے، قرآنِ کریم نے اس غلط انداز کی نفی کرتے ہوئے فرمایا:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا

اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا. (الاحزاب ایت ۳۶)

''کسی مومن مرد یا عورت کے لئے جائز نہیں کہ اللہ اور اس کے رسول علیہ السلام کے فیصلے کے بعد ان کو اپنے کسی امر کے بارے میں اختیار ہو اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلی گمراہی میں جا پڑا''۔

اس آیت نے بالکل واضح کر دیا کہ خدا کا رسول ﷺ جب کوئی فیصلہ کر دے تو پھر کسی کو اس سے سرتابی کا اختیار نہیں رہتا، دنیا میں کسی حاکم یا فرضی ''مرکزِ ملت'' کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے کہ اس کے فیصلے سے سرِ مو انحراف کرنا گمراہی کا موجب بن جائے، یہ شان صرف اسی رسولِ مقبول ﷺ کی ہے جس کا قول و فعل امت کے لئے حجت ہے۔

نویں دلیل

قرآن مجید میں رسولِ خدا ﷺ کی پیروی کو معیارِ ہدایت قرار دیا ہے چنانچہ سورۂ اعراف میں ارشاد ہوتا ہے:

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ. (الاعراف ایت ۱۵۸)

''ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسولِ اُمی ﷺ پر جو اللہ اور اس کے کلمات پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی پیروی کرو تا کہ تم راہ پاؤ''

دسویں دلیل

قرآنِ کریم کی مذکورہ بالا آیات پیغمبر برحق ﷺ کی سنت کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے کافی ووافی ہیں، اب ہم آخر میں ایک ایسی آیت پر اس بحث کو ختم کرنا چاہتے ہیں جس میں عملی طور پر اوامر ونواہی میں رسولِ خدا ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا

(الحشر ایت ۷)

”تمہیں رسول اللہ ﷺ جو کچھ عطا فرمائیں وہ لے لو اور جس چیز سے روک دیں، رک جاؤ“۔

یہاں پر پورے عموم کے ساتھ جمیع اوامر ونواہی میں رسولِ خدا کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور عبادات ومعاملات میں کوئی تفریق نہیں کی گئی۔ اس مقام پر کچھ منکرین حدیث نے یہ تاویل کی ہے کہ یہ آیت صرف مالِ غنیمت کی تقسیم کے متعلق ہے کیونکہ اٰتٰی کا لفظ محسوس چیزوں کے دینے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور احادیث تو اقوال کا مجموعہ ہیں، ان کے لئے اس لفظ کا استعمال درست نہیں لیکن یہ ایک خوشنما مغالطہ کے سوا کچھ نہیں، قرآنِ مجید میں کئی مقامات پر اس علم وحکمت وغیرہ کے لئے بھی یہی لفظ استعمال ہوا ہے مثلاً

اٰتَیْنٰہُ الْعِلْمَ، اٰتَیْنٰہُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ، اٰتَیْنَا الْحُکْمَ

وَفَصۡلَ الۡخِطَابِ وغیرہ۔

جب علم، کتاب، حکمت اور قولِ فیصل کے دینے کیلئے یہ لفظ استعمال ہو سکتا ہے تو سنت و حدیث کے لئے اس کے استعمال میں کونسی قباحت ہے ؟ پھر اسے مالِ غنیمت کے ساتھ مخصوص کرنا ایک تو کلمہ ''مَا'' کے عموم کے منافی ہے دوسرا جامعیتِ قرآن سے لاعلمی کی دلیل ہے، صحابہ کرام جو قرآن کے اولین مخاطب تھے اور اہل زبان بھی، انہوں نے اس آیت کو عمومی معنیٰ پر رکھا اور اس سے جامع مفہوم مراد لیا چنانچہ صحیح مسلم وغیرہ کی روایت ہے:

''ایک بار حضرت عبداللہ بن مسعود کی خدمت میں قبیلہ بنی اسد کی عورت حاضر ہو کر عرض کرنے لگی، میں نے سنا ہے کہ آپ ان عورتوں پر لعنت فرماتے ہیں جو جسم گوندتی یا مصنوعی بال لگاتی ہیں، آپ نے فرمایا جس پر خدا نے لعنت کی ہو اور وہ لعنت قرآن میں مذکور ہو، میں اس پر کیوں لعنت نہ کروں؟ اس عورت نے عرض کیا قرآنِ مجید تو میں بھی پڑھتی ہوں مگر میں نے تو قرآن میں کہیں نہیں دیکھا، آپ نے فرمایا اگر تو قرآن سمجھ کر پڑھتی تو یقیناً یہ مسئلہ پا لیتی کیا قرآن میں نہیں ہے کہ ''جو کچھ اللہ کے رسول عطا کریں وہ لے لو جس سے روک دیں اس سے رک جاؤ'' جب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لَعَنَ اللّٰهُ الۡوَاشِمَاتِ تو یوں سمجھو کہ خود قرآن نے ہی جسم گوندنے والی عورتوں (نیل بھرنے والی عورتوں) پر لعنت فرما دی ہے''۔[1]

---

[1] صحیح مسلم، ج ۱: ص ۲۰۵۔

اسی طرح حضرت عبدالرحمٰن بن یزید کا واقعہ ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو حالتِ احرام میں سلے ہوئے کپڑے پہنے دیکھا تو منع کیا، اسنے کہا کہ قرآن میں تو اس کو منع نہیں کیا گیا! چنانچہ آپ نے مذکورہ بالا آیت سنا دی [۲] اور یوں اسے متنبہ کر دیا کہ رسولِ خدا ﷺ کا کسی چیز سے منع فرمانا خدا کا منع فرمانا ہی ہے۔

اسی قسم کے کئی واقعات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرام جو قرآن فہمی میں سب کے امام ہیں، رسولِ خدا ﷺ کے احکام کی اطاعت کو احکامِ خداوندی کی اطاعت سمجھتے تھے۔

عبادات و معاملات کی تفریق

منکرین سنت میں سے کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ عبادات میں تو سنتِ رسول کی پیروی کی جائے لیکن معاملات میں حالاتِ زمانہ کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ اس بارے میں سنتِ رسول ﷺ کو حجت نہ ٹھہرایا جائے۔

اہل تحقیق خوب جانتے ہیں کہ ان کی یہ خود ساختہ تفریق قرآن کی تحریف کے مترادف ہے اس لئے کہ قرآن نے تو عبادات و معاملات کی تفریق کئے بغیر مطلقاً رسولِ اکرم ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا ہے، پھر یہ تفریق کیونکر صحیح ہو سکتی ہے؟! اگر ایک مسلمان نماز، روزہ اور حج و زکوٰۃ بجالاتا ہے تو

[۱] الموافقات، (شاطبی) ج ۴: ص ۲۵۔

صرف اس لئے کہ خدا کا حکم ہے اور اگر لین دین میں حرام خوری، سود خوری سے بچتا ہے اور حلال ذرائع سے کسبِ معاش کرتا ہے تو یہ بھی خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت کی بنا پر!

اہل سنت کے مایہ ناز فاضل حضرت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری بھیروی رحمۃ اللہ علیہ نے اس تفریق کا منشا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"لیکن جب ہم نے اسلام کا دامن چھوڑا اور اس جرم کی پاداش میں ہم پر انگریز کی غلامی مسلط کر دی گئی تو انگریز نے سب سے پہلے عبادات و معاملات کے تشریعی اور قانونی تفاوت کا نظریہ پیش کیا۔ نماز، روزہ کو عبادت کہا اور اس میں مسلمانوں کو آزادی دے دی اور اپنے عدل وانصاف اور رواداری و فراخدلی کے قصیدے ساری دنیا کو سنائے اور زندگی کی باقی ضروریات کو معاملات کہہ کر دین سے جدا کر دیا اور وہاں مسلمانوں کو اپنے قانون کا پابند بنا دیا"۔

یہ صورتِ حال دو سو سال تک رہی، اس سے آہستہ آہستہ لوگوں کے دلوں میں، جو اسلام کے نظامِ کامل سے نا آشنا ہیں، یہ خیال پختہ ہو گیا کہ اسلام کی عبادات اور اسلام کے اقتصادی، معاشرتی اور اخلاقی نظام میں بہت فرق ہے، عبادات سے انکار یا ان میں تغیر و تبدل کرتے وقت وہ مشتعل ہو جاتے ہیں لیکن اسلام کے دوسرے احکام کو پس پشت ڈالنے اور اس کی جگہ دوسرے قوانین پر عمل کرنے میں وہ کچھ حرج محسوس نہیں کرتے۔

یہ حضرات قوم کی اس ذہنی کیفیت سے واقف ہیں جو غلامی کی اس طویل مدت کے دوران پیدا ہوگئی ہے اس لئے وہ پہلے معاملات کے اسلامی قوانین کو نسخ اور مسخ کرنے کے لئے کوشاں ہیں اور ان کا یہ خیال ہے کہ اگر وہ اس مرحلہ میں کامیاب ہو گئے تو عبادات میں اپنے تصرفاتِ شاہانہ سے ردّوبدل کرنا ان کے لئے کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوگا"۔ [1]

حدیث وسنت کی تفریق

یہ لوگ سنت وحدیث کے درمیان ایک مصنوعی خلیج حائل کرنے کے لئے یہ بھی کہتے ہیں کہ حالاتِ زمانہ کے مطابق سنتِ نبویہ میں تغیر وتبدل کرنا عین اقتضائے سنت اور منشائے نبوت ہے البتہ سنتِ نبویہ کے پیش کردہ نقشہ زندگی کو دائمی اور لازوال سمجھنا اتباع حدیث ہے، ان کے نزدیک حدیث کی نشرواشاعت سنت کے لئے سخت مضر ہے حالانکہ پوری امت اس بات پر متفق ہے کہ حدیث کی نشرواشاعت سے ہی سنتِ نبویہ کی حفاظت ہوئی ہے حضور ﷺ کی سنت اور آپ کی احادیثِ طیبہ ایک حقیقت کی دو تعبیریں ہیں لہٰذا انہیں ایک دوسرے کا مقابل قرار دینا تعصب اور کج فہمی نہیں تو اور کیا ہے؟

سنت اور تشریح قرآن

اتباع سنت کی اہمیت واضح کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے

---

[1] سنت خیر الانام، ص ۶۳۔

کہ قرآن سے اس کے تعلق کو بھی واضح کیا جائے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ جس طرح قرآنِ مجید کے الفاظ کو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا اسی طرح اس کے معانی ومطالب کی وضاحت کو بھی اپنے ذمے لیا، ارشادِ ربانی ہے:

لَاتُحَرِّکْ بِہٖ لِسَانَکَ لِتَعْجَلَ بِہٖ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَہٗ وَقُرْاٰنَہٗ فَاِذَا قَرَاْنٰہُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَہٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ. (القیٰمۃ ایت۱۶تا۱۹)

”تم یاد کرنے کی جلدی میں زبان کو حرکت نہ دو، بے شک اس کا محفوظ کرنا اور پڑھنا ہمارے ذمہ ہے، جب ہم اسے پڑھ چکیں اس وقت اس پڑھے ہوئے کی اتباع کرو، پھر بے شک اس کی باریکیوں کو ظاہر کرنا ہمارے ذمہ ہے“۔

اس آیت نے واضح کر دیا کہ جمعِ الفاظ کے علاوہ قرآن کے مطالب ومقاصد کا بیان بھی رب تعالیٰ نے اپنے ذمے لیا ہے کیونکہ انسانی عقل چاہے کتنی بھی کامل ہو، کلامِ الٰہی کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی علیہ السلام کو جس طرح اپنی ذات کی معرفت کے لئے وسیلہ بنایا ہے، اسی طرح کلامِ رسول ﷺ کو اپنے کلام سمجھنے کا ذریعہ بنایا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ کلامِ رسول ﷺ کے فہم کے بغیر کلامِ الٰہی تک رسائی ناممکن ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک ﷺ کی اسی شانِ تبیین وتشریح کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

وَاَنۡزَلۡنَآ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡهِمۡ وَلَعَلَّهُمۡ یَتَفَکَّرُوۡنَ. (النحل ایت ۴۴)

"اے محبوب! ہم نے آپ کی طرف یہ ذکر نازل کیا تاکہ آپ لوگوں سے بیان کریں جو ان کی طرف اتارا گیا اور تاکہ وہ غور و فکر سے کام لیں"۔

اسی سورت میں دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

وَمَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِی اخۡتَلَفُوۡا فِیۡهِ وَهُدًی وَّرَحۡمَةً لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ. (النحل ایت ۶۴)

"اور ہم نے یہ کتاب نہیں اتاری مگر اس لئے کہ آپ لوگوں کے سامنے بیان کر دیں وہ بات جس میں وہ اختلاف کریں اور یہ ہدایت و رحمت ہے ایمان والوں کے لئے"۔

سورۃ النحل کی پہلی محولہ بالا آیت میں وَلَعَلَّهُمۡ یَتَفَکَّرُوۡنَ کے جملہ سے اس حقیقت کی طرف اشارہ فرما دیا کہ بیانِ رسول ﷺ کے بعد ہی غور و فکر کی اجازت ہے کیونکہ جہاں تک قرآنِ مجید کی یقینی مراد کا کام ہے وہ اللہ کا رسول علیہ السلام ہی انجام دے سکتا ہے البتہ اس کے بیان کردہ معانی میں غور و فکر اور تدبر کر کے ہر صاحب عقل سلیم فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

دوسری آیت میں بتا دیا گیا ہے کہ اگر آیات کے معانی سمجھنے میں اختلاف رونما ہو جائے یا دیگر معاملات میں اختلاف رائے رونما ہو اور ہر شخص اپنی رائے کو حق کے مطابق ظاہر کرے تو اس صورت میں اختلاف ختم

کرنے کی واحد صورت یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ کے بیان (احادیث) کی طرف رجوع کیا جائے۔

یہاں سے یہ بات واضح ہوگئی کہ بیان قرآن، نظم قرآن سے علاوہ چیز ہے لہٰذا بیان قرآن یا تبیین قرآن کا مفہوم صرف قرآن پڑھ کر سنا دینا نہیں۔

ایک شبہ کا ازالہ

بعض لوگ یہ شبہ پیش کرتے ہیں کہ قرآن کریم ایک جامع اور مفصل کتاب ہے چنانچہ قرآن اپنے آپ کو کتابِ مفصل اور تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ قرار دیتا ہے لہٰذا قرآن کے لئے سنت وحدیث کو بیان ٹھہرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کہ قرآن کا کتابِ مفصل ہونا مخاطب بلا واسطہ یعنی حضور رسولِ اکرم ﷺ کے لئے ہے لیکن جہاں تک امت کا تعلق ہے وہ رسولِ کریم ﷺ کے قول وفعل کی روشنی میں اس کتاب کی تفصیل وتشریح کو سمجھ سکتی ہے، کوئی آدمی چاہے کتنا ہی عقلمند ہو، رسولِ خدا ﷺ کے بیان کی روشنی کے بغیر کتاب اللہ کے مطالب نہیں سمجھ سکتا چنانچہ علامہ زمخشری باوجود معتزلی ہونے کے، اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

قُلْتُ اَلْمَعْنٰی اَنَّهٗ بَیَّنَ کُلَّ شَیْئٍ مِنْ اُمُوْرِ الدِّیْنِ حَیْثُ کَانَ نَصًّا عَلٰی بَعْضِهَا وَاِحَالَةً عَلَی السُّنَّةِ حَیْثُ اَمَرَ فِیْهِ بِاتِّبَاعِ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَقِیْلَ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی.[1]

---

[1] تفسیر کشاف، ج ۲:۶۲۸۔

”میں کہتا ہوں قرآن تمام امورِ دین کا بیان بایں معنٰی ہے کہ اس نے بعض احکام کو اپنی نص کے ساتھ بیان کر دیا ہے اور باقی کو سنت کے حوالے کر دیا ہے جیسا کہ قرآن میں اتباعِ رسول علیہ السلام کا حکم دیا گیا ہے اور یہ فرمایا گیا ہے کہ آپ اپنی خواہش سے کلام نہیں فرماتے بلکہ آپ کا کلام وحیِ الٰہی ہوتا ہے جو آپ کی طرف بھیجی جاتی ہے“۔

اسی طرح علامہ ابن کثیرِ دمشقی اسی آیت کے تحت لکھتے ہیں:

قَالَ الْاَوْزَاعِیُ تِبْیَاناً لِّکُلِّ شَیْئٍ بِالسُّنَّةِ[1]

”امامِ اوزاعی فرماتے ہیں قرآن کا ہر چیز کے لئے تبیان ہونا سنت وحدیث کے ساتھ ہے“۔

جامعیتِ قرآن کا صحیح مفہوم

جہاں تک قرآن مجید کی جامعیت کا تعلق ہے، کسی کو اس سے انکار نہیں لیکن قرآن کی جامعیت کا یہ مفہوم تو نہیں کہ اس کی کسی آیت میں اجمال نہیں، کسی عموم میں احتمالِ تخصیص نہیں، قرآن نے تمام مسائل کا تفصیلی ذکر کر دیا ہے اور تمام جزئیات اس میں موجود ہیں اور فرائض وواجبات، سنن ومستحبات کا تفصیلی تذکرہ اس میں موجود ہے، کتاب اللہ کے جامع ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ رسولِ خدا ﷺ کے قول وفعل اور اسوۂ حسنہ کی روشنی میں وہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر، ج ۲: ص ۵۸۲۔

امت کے لئے مکمل سرچشمہ ہدایت ہے جس کے بعد امت کو کسی اور طرف آس لگانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، حقیقت میں رب تعالیٰ کا احسانِ عظیم ہے کہ اس نے اپنے حبیبِ پاک ﷺ کے ذریعے قرآن کے حقائق کو واضح فرما دیا اور تمام شبہات کا ازالہ کر دیا جو عقل انسانی کے لئے ٹھوکر کھانے کا سبب بن سکتے تھے۔

ہم وضاحت کے لئے بیانِ رسول ﷺ کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں جن سے اندازہ ہو سکے گا کہ صحابہ کرام، جو اہل زبان اور فصاحت وبلاغت کے ساتھ متصف تھے انہیں بھی قرآن فہمی میں اشکالات پیش آ جاتے تھے اور وہ اسی معلم ومربی ﷺ کی طرف رجوع کرتے تھے جو ان پر حق کو واضح کر دیتے تھے۔

فہمِ قرآن میں صحابہ کی الجھنوں کا حضور ﷺ کی طرف سے حل

(۱) صحیح بخاری میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ○

”وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان میں کوئی ظلم شامل نہیں کیا، یہی لوگ ہیں جن کو امن ملے گا اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں“۔

یہ حکم سن کر صحابہ کرام گھبرا گئے اور عرض کرنے لگے ہم میں سے ایسا

کون ہے جس نے اپنے نفس پر کوئی نہ کوئی ظلم نہ کیا ہو، پس آیت کے بموجب تو ہم میں کوئی بھی مستحقِ امن نہیں رہے گا، رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا یہاں پر ظلم سے مراد عام ظلم نہیں بلکہ شرک مراد ہے[1] جب کہ سورۂ لقمان میں ارشاد ہوتا ہے اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ٥ ''شرک بہت بڑا ظلم ہے''۔

(٢) تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ جب یہ نازل ہوئی:

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَایُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ٥

''جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی خبر سنادیجئے''۔

صحابہ کرام کو یہ سن کر سخت فکر لاحق ہوئی کیونکہ ان میں سے بعض اہل ثروت بھی تھے انہوں نے آپ کی خدمت میں اپنی الجھنیں پیش کیں تو آپ نے فرمایا یہ وعید اُن لوگوں کے لئے ہے جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتے، شرعاً کنز بھی وہی مال ہے جس میں سے زکوٰۃ ادا نہ کی جائے، پھر آپ نے ان کی مزید تسلی کے لئے فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ لَمْ یَفْرِضِ الزَّکٰوۃَ اِلَّا لِیُطَیِّبَ بِھَا مَابَقِیَ مِنْ اَمْوَالِکُمْ.[2] ''اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے[3] کہ بقیہ مال بھی پاک ہوجائے''۔

---

[1] صحیح بخاری (مصری:) ٢٠٣٦۔

[2] تفسیر ابن کثیر، ج ٢: ص ٣٥١۔

(۳) ایک مرتبہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا، قیامت کے دن جس کا حساب لیا گیا سمجھ لو کہ وہ ہلاک ہوا، اس پر ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا کہ قرآنِ مجید تو فرماتا ہے:

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتَابَهٗ بِیَمِیْنِهٖ فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا۔ (الانشقاق ایت ۷، ۸)

"جس کو داہنے ہاتھ میں نامہ اعمال دیا گیا اس کا حساب آسان ہوگا"۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ حساب کے باوجود ہلاک نہ ہوں گے، آپ نے فرمایا حسابِ یسیر کے معنٰی عرضِ اعمال کے ہیں یعنی اعمال نامہ انکے سامنے رکھ کر اُن کو صرف جتلا دیا جائے گا مگر اس پر باز پرس نہ ہوگی، اگر کسی سے مناقشہ کیا گیا تو سمجھ لو کہ وہ ہلاک ہوا، یہ سن کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا شبہ رفع ہوگیا۔[۱]

(۴) بعض صحابہ کرام کو آیۂ کریمہ وَمَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءً یُّجْزَ بِهٖ (جس نے برا عمل کیا وہ سزا پائے گا) سن کر یہ شبہ لاحق ہوا کہ ہر انسان سے کوئی نہ کوئی قصور تو ہوتا ہی ہے لہٰذا اس آیت کی رو سے ہر شخص کا عذاب میں گرفتار ہونا ضروری ہے، آپ نے فرمایا کہ "یُجْزَ بِهٖ" سے صرف جہنم کا عذاب مراد نہیں بلکہ ہر وہ تکلیف جو مسلمان کو پہنچتی ہے یہاں تک کہ چلتے میں ٹھوکر لگ جانا یا پاؤں میں کانٹا چبھ جانا، یہ بھی مسلمان کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے۔[۲]

---

[۱] صحیح بخاری، ج ۱: ۳۔

[۲] جامع ترمذی، ج ۲: ۱۳۴۔

اسی طرح رسولِ خدا ﷺ نے صحابہ کرام کے سامنے قرآنِ مجید کے مجملات کی تفصیل و تفسیر بیان کی، چنانچہ آپ نے اُن پر واضح فرمادیا کہ خیط ابیض سے مراد دن کی سفیدی اور خیطِ اسود سے مراد رات کی سیاہی ہے "یَاْتِیْ بَعْضُ اٰیَاتِ رَبِّکَ" سے مراد مغرب سے سورج کا نکلنا ہے[1] اور ارشاد خداوندی ہے لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَزِیَادَۃٌ میں "زِیَادَۃٌ" سے مراد دیدارِ الٰہی ہے۔[2]

غرضیکہ کتبِ حدیث میں اس قسم کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے اپنی احادیث سے قرآنِ پاک کی تشریح فرمائی اور صحابہ کرام نے اہل زبان ہونے کے باوجود آپ سے فہم قرآن کی خاطر سبق لیا لہٰذا کوئی شخص اب محض زبان دانی کی بنا پر یا لغات القرآن میں مہارتِ تامہ رکھنے کی بنا پر قرآن فہمی کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔

غور کا مقام ہے کہ حضرتِ عمر ؓ جیسی بزرگ اور ذہین وفطین ہستی صرف سورۂ بقرۃ کا علم حاصل کرنے پر بارہ سال صرف کردیتی ہے[3] جو لوگ حضرت عمر ؓ کے ارشاد "حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ"[4] (ہمیں اللہ کی کتاب کافی ہے) کو اپنے لئے بطورِ سند پیش کرتے ہیں، وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ اس تربیت یافتہ بارگاہِ نبوت کا ارشاد ہے جس نے بارہ سال تک

---

[1] صحیح مسلم، ج۱: ص۸۸۔ [2] جامع ترمذی، ج۲: ص۱۴۲۔ ایضاً صحیح مسلم، ج۱: ص۱۰۰۔
[3] تفسیر فتح العزیز، ج۱: ص۶۶۔ [4] صحیح مسلم، ج۲: ص۴۳۔

صرف سورۂ بقرۃ کی تعلیم پانے کے لئے صرف کر دیئے تھے لہٰذا ان کا "حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ" کہنا بایں معنٰی ہے کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور آپ کے قول و فعل کی روشنی میں قرآن کا جو علم حاصل ہوا ہے وہ ہماری ہدایت کے لئے کافی ہے جس کے بعد کسی نوشتہ کی ضرورت نہیں رہتی، ہم میں سے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ احادیث سے قطع نظر کر کے صرف اپنی زبان دانی کی بنا پر قرآن دانی کا دعویٰ کرے اور سنت و حدیث سے انحراف کے لئے اس عاشقِ رسول علیہ السلام کے ارشادات کو بطور ڈھال استعمال کرے جس کی پوری زندگی حفاظتِ سنت میں گزری تھی۔

قرآن وسنت کا باہمی ربط

قرآن وسنت میں جو گہرا ربط ہے اسے سمجھ لینے کے بعد انکارِ سنت کی گنجائش باقی نہیں رہتی، امامِ شاطبی نے اس تعلق کو بڑے عمدہ الفاظ میں بیان کیا ہے لکھتے ہیں:

اَلسُّنَّۃُ رَاجِعَۃٌ فِیْ مَعْنَاھَا اِلَی الْکِتَابِ فَھِیَ تَفْصِیْلُ مُجْمَلِہٖ وَبَیَانُ مُشْکِلِہٖ وَبَسْطُ مُخْتَصَرِہٖ۔[1]

"سنت حقیقت میں قرآن کی طرف راجع ہے، یہ قرآنِ مجید کے مجملات کی تفصیل، مشکلات کا بیان اور اس کے مختصرات کی تشریح کرتی ہے"۔

---

[1] الموافقات، ج ۴، ص ۱۲۔

مجملات کی تفصیل سے مراد یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور اسی طرح دیگر عبادات و معاملات کی تفصیل ذکر نہیں کی گئی، قرآنِ کریم نے "اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ" فرمایا ہے اور سنت نے اس کی ایک ایک جز کی تفصیل کی ہے، یہی حال باقی ارکانِ اسلام کا ہے۔ مشکلات کی تفسیر کی چند مثالیں گزشتہ صفحات میں ذکر کی جا چکی ہیں۔ مختصرات کی تشریح یوں سمجھئے کہ قرآنِ مجید نے مختصراً فرمادیا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ (البقرۃ آیت ۱۴۳)

"اسی طرح ہم نے تمہیں امتِ وسط بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور خدا کا رسول تمہارے لئے گواہی دے"۔

حدیث نے اس کی تشریح کرتے ہوئے بتایا کہ جب قیامت کے دن انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتیں آئیں گی تو انبیاء کرام سے تبلیغ دین کے بارے پوچھا جائے گا ان کی امتیں کذب بیانی سے کام لے کر کہہ دیں گی کہ ہمارے پاس خدا کے عذاب سے ڈرانے کے لئے کوئی نہیں آیا تھا۔ رسولوں سے پوچھا جائے گا کہ تمہارا کوئی گواہ بھی ہے وہ حضور ﷺ کی امت کا نام لیں گے اس وقت اُمتِ محمدیہ رسولوں کے حق میں گواہی دے گی اور رسولِ اکرم ﷺ خود اپنی امت کے حق میں گواہی دیں گے[1] اور اسی طرح حضور ﷺ

---

[1] جامع ترمذی، ج ۲: ص ۱۲۵۔

خاتم الشہداء ہوں گے یعنی آپ کی شہادت پر آخری اور قطعی فیصلہ ہوگا۔

امامِ اوزاعی کے کلام سے پیدا شدہ اشکال کا جواب

بعض حضرات نے یہاں یہ مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے کہ روایت پرست طبقہ، سنت کو قرآن سے بڑھا دیتا ہے۔ شام کے مشہور محدث امام اوزاعی سے منقول ہے کہ ”اَلْکِتَابُ اَحْوَجُ اِلَی السُّنَّۃِ مِنَ السُّنَّۃِ اِلَی الْکِتَابِ“ [1] اور اسی طرح یہ بھی منقول ہے کہ ”اَلسُّنَّۃُ قَاضِیَۃٌ عَلَی الْکِتَابِ“ اس سے منکرین حدیث کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ ان حضرات کے نزدیک سنت کی اہمیت قرآن سے بڑھ گئی ہے یہ سنت کو کتاب پر حاکم قرار دیتے ہیں اور کتاب کو سنت کی طرف محتاج مانتے ہیں نہ کہ سنت کو کتاب کی طرف، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سنت و حدیث کو حجت ماننے والے ہمیشہ کتاب اللہ کو اولیت دیتے ہیں اور سنت کو ثانوی درجہ دیتے ہیں، علامہ شاطبی کا یہ قول تمام روایت پسند طبقہ میں مقبول ہے:

رُتْبَۃُ السُّنَّۃِ اَلتَّاَخُّرُ عَنِ الْکِتَابِ فِی الْاِعْتِبَارِ۔ [2]

”سنت کا مرتبہ کتاب اللہ سے مؤخر ہے“۔

امامِ اوزاعی کے قول کا مفہوم یہ ہے کہ ہم کتاب کو سمجھنے کے لئے سنت کے زیادہ محتاج ہیں، اس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ سنت، کتاب اللہ کی تفسیر اور شرح کی حیثیت رکھتی ہے اور قرآنِ کریم اصل متن کی، متن کو سمجھنے

---

[1] جامع بیان العلم (ابن عبد البر مالکی)، ج ۲: ص ۱۹۱۔ [2] الموافقات، ج ۴: ص ۴۔

کے لئے شرح کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے، سنت کے کتاب اللہ پر قاضی ہونے سے یہ مراد ہے کہ آیت کے اندر جو عقلی طور پر مختلف احتمالات ہوتے ہیں "سنت" ان میں سے معنٰی مرادی کو واضح کر دیتی ہے اور وہی مفہوم قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا ہے جس کے مقابلے میں دوسرے عقلی احتمالات کو ترک کرنا پڑتا ہے چنانچہ علامہ شاطبی فرماتے ہیں:

فَمَعْنٰى كَوْنِ السُّنَّةِ قَاضِيَةً عَلَى الْكِتَابِ اَنَّهَا مُبَيِّنَةٌ لَهٗ فَلَا يُوْقِفُ عَلٰى اِجْمَالِهٖ وَاِحْتِمَالِهٖ وَقَدْ بَيَّنَتِ الْمَقْصُوْدَ مِنْهُ لَا اَنَّهَا مُقَدَّمَةٌ عَلَيْهِ۔ [1]

"سنت کے قاضی ہونے سے مراد یہ ہے کہ یہ معنٰی مرادی کی وضاحت کر دیتی ہے اور اجمال و احتمال پر ٹھہرنے کی بجائے معنٰی مقصودی تک لے جاتی ہے، اس کے یہ معنٰی نہیں کہ وہ کتاب اللہ سے مقدم ہے"۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ قرآنِ کریم نے چور کی سزا قطع ید مقرر فرمائی ہے مگر یہ نہیں بتایا کہ کتنا مال چرانے پر یہ سزا دی جائے، احادیث مبارکہ سے پتا چلتا ہے کہ اس مال کی مقدار کم از کم دس درہم ہے۔ [2] اسی طرح قرآنِ کریم میں ربا کی حرمت پر نص قائم کی گئی ہے، حدیث نے تفصیل سے ان چیزوں کے نام بتائے جن میں تفاضل اور نسیہ منع ہیں، نیز یہ بھی بتایا کہ اختلافِ جنس کی صورت میں تفاضل جائز ہے اور نسیہ منع، [3] غرضیکہ

---

[1] الموافقات، ج ۴: ص ۱۰۸۔ [2] طحاوی شریف، حدیث ام ایمن، ۲: ۱۰۵۔ [3] صحیح مسلم، ج ۲: ص ۲۵۔

امامِ اوزاعی نے ایسی کوئی بات نہیں کی جو عظمتِ قرآن کے منافی ہو لہٰذا یہ اعتراض سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے۔

سنت بحیثیت مأخذ تشریع

سنت صرف شارحِ قرآن ہی نہیں بلکہ تشریع کا مستقل مأخذ وسرچشمہ بھی ہے۔ سنت جس طرح قرآنی مجملات کی تفصیل اور مختصرات کی تشریح کرتی ہے۔ اسی طرح بعض وہ احکام بھی بیان کرتی ہے جن سے کتاب اللہ ساکت ہے۔ علامہ ابن قیم سنت کی مختلف حیثیتوں کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اَلسُّنَّةُ مَعَ الْقُرْاٰنِ عَلٰی ثَلَاثَةِ اَوْجُهٍ اَحَدُهَا اَنْ تَكُوْنَ مُوَافِقَةً لَهٗ مِنْ كُلِّ وَجْهٍ فَيَكُوْنُ تَوَارُدُ الْقُرْاٰنِ وَالسُّنَّةِ عَلٰی الْحُكْمِ الْوَاحِدِ وَمِنْ بَابِ تَوَارُدِ الْاَدِلَّةِ وَتَظَافُرِهَا اَلثَّانِيْ اَنْ تَكُوْنَ بَيَانًا لِّمَا اُرِيْدَ بِالْقُرْاٰنِ وَتَفْسِيْرًا لَهٗ اَلثَّالِثُ اَنْ تَكُوْنَ مُوْجِبَةً لِحُكْمٍ سَكَتَ الْقُرْاٰنُ عَنْ اِيْجَابِهٖ اَوْمُحَرِّمَةً لِّمَا سَكَتَ عَنْ تَحْرِيْمِهٖ وَهِيَ تَخْرُجُ عَنْ هٰذِهِ الْاَقْسَامِ فَلَّا تُعَارِضُ الْقُرْاٰنَ بِوَجْهٍ مَّا فَمَا كَانَ زَائِدًا مِنْهَا فَهُوَ تَشْرِيْعٌ مُبْتَدَأٌ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ تَجِبُ طَاعَتُهٗ فِيْهِ وَلَا تَحِلُّ مَعْصِيَتُهٗ وَلَيْسَ هٰذَا تَقْدِيْمًا لَهَا عَلٰی كِتَابِ اللّٰهِ بَلْ اِمْتِثَالٌ لِّمَا اَمَرَ

اَللّٰہُ بِہٖ مِنْ طَاعَۃِ رَسُوْلِہٖ۔[1]

"سنت کا قرآن سے سہ گونہ تعلق ہے ایک تو یہ کہ سنت مکمل طور پر قرآن کے موافق ہو پس قرآن وسنت کا توارد ایک ہی حکم کے بارے میں ایسا ہو جس میں کئی دلائل ایک ہی مسئلے کے بارے میں وارد ہوں، دوسرا یہ کہ سنت قرآن کے لئے بیان اور تفسیر بن رہی ہو، تیسرا یہ کہ وہ ایسے حکم کو واجب کر رہی ہو جس سے قرآن خاموش ہو یا کسی ایسی چیز کو حرام کر رہی ہو جس کے حرام کرنے سے قرآن ساکت ہو۔ سنت ان اقسامِ ثلاثہ کے دائرے سے باہر نہیں ہوا کرتی اور وہ کسی صورت میں قرآن کے معارض نہیں ہوا کرتی، جو احکام سنت میں زائد ملتے ہیں وہ رسولِ خدا ﷺ کا تشریعی کارنامہ ہے، اس میں آپ کی اطاعت ضروری ہے اور آپ کی نافرمانی کرنا قطعاً حلال نہیں، اس سے کتاب اللہ پر سنت کی فوقیت لازم نہیں آتی بلکہ خدا نے اطاعتِ رسول ﷺ کا جو حکم دیا ہے اس کی تعمیل ثابت ہوتی ہے"۔

حافظ ابن قیم کے مذکورہ بالا بیان سے حسبِ ذیل امور منقح ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔

(۱) سنت بعض اوقات قرآنی حکم کی محض تقریر و تائید کرتی ہے اس وقت یہ قرآن کے لئے بیان تقریر کی حیثیت رکھتی ہے۔

(۲) سنت بعض اوقات قرآنی مجملات کی تشریح و تفسیر کرتی ہے

---

[1] اعلام الموقعین، ج ۲ :۲۸۸۔

اس صورت میں ہم اسے بیانِ تفسیر کہہ سکتے ہیں۔

(۳) سنت کی تیسری حیثیت یہ ہے کہ وہ بعض اوقات ان چیزوں کو حرام قرار دیتی ہے جن کی تحریم سے قرآن ساکت ہے اور ان چیزوں کو حلال قرار دیتی ہے جن کی حلت کا بیان قرآن میں نہیں، اس صورت میں سنت کو بیانِ زیادت کہہ سکتے ہیں۔

(۴) سنت کسی صورت میں بھی قرآن سے حقیقۃً معارض نہیں ہوتی بعض اوقات صورۃً تعارض پایا جاتا ہے جو فکرِ عمیق کے بعد دور ہو جاتا ہے۔

(۵) سنت کو زائد علی القرآن ماننے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ کتاب اللہ سے مقدم ہے۔

(٦) اللہ تعالیٰ نے رسولِ اکرم ﷺ کی غیر مشروط اطاعت کا حکم دیا ہے اس لئے سنت کو حجت ماننا درحقیقت حکمِ خداوندی کی تعمیل کرنا ہے۔

قرآن وحدیث میں سنت کی تشریعی حیثیت کا ذکر

قرآن حکیم نے جس طرح سنتِ رسول ﷺ کے شارح اور بیانِ قرآن ہونے کی وضاحت کی ہے اسی طرح سنت کی مستقل تشریعی حیثیت کو بھی واضح کیا ہے چنانچہ سورۂ اعراف میں ارشاد ہوتا ہے:

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَآئِثَ

"اللہ کا رسول ان کے لئے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا ہے اور ناپاک

چیزیں حرام فرماتا ہے"۔

کچھ لوگ یہاں یہ مغالطہ دیتے ہیں کہ تحلیل وتحریم کی نسبت رسولِ خدا ﷺ کی طرف مجازی ہے حقیقۃً قرآن میں جو حلال وحرام بیان کیا گیا ہے، رسولِ اکرم ﷺ اسی کو بیان فرمانے والے ہیں مگر صاحب ذوقِ سلیم اور ارباب بصیرت سے پوشیدہ نہیں کہ ان آیات میں پیغمبر اسلام ﷺ کے خصائص وفضائل کا ذکر مقصود ہے چنانچہ اس کے ماقبل میں ارشاد خداوندی ہے:

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ۔

"وہ لوگ جو رسول نبی اُمی کی پیروی کرتے ہیں جس کی بشارت کو تورات وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں وہ انہیں بھلائی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے"۔

یہاں پر حضور خاتم النبیین ﷺ کا نبی اُمی ہونا تورات وانجیل میں آپ کی بشارت کا موجود ہونا، آپ کا امر بالمعروف ونہی عن المنکر فرمانا ذکر کیا گیا ہے، اس کے بعد متصلاً فرمایا گیا۔

وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْهِمْ. (الاعراف ایت ۱۵۷)

"وہ ان کے لئے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزوں کو حرام کرتا ہے اور ان سے وہ بوجھ اور طوق اتار دیتا ہے جو ان پر پہلے سے موجود تھے"۔

ان آیات پر غور کرنے سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح امر بالمعروف ونہی عن المنکر ودیگر صفات حضور اکرم ﷺ کی حقیقی صفات ہیں، اسی طرح تحلیل وتحریم کا اختیار بھی حضور ﷺ کو حقیقۃً حاصل ہے اسی بنا پر رسولِ خدا ﷺ فرماتے ہیں:

اَلَآ اِنِّیۡ اُوۡتِیۡتُ الۡکِتَابَ وَمِثۡلَهٗ مَعَهٗ اَلَا یُوۡشِکُ رَجُلٌ شَبۡعَانٌ عَلٰی اَرِیۡکَتِهٖ یَقُوۡلُ عَلَیۡکُمۡ بِهٰذَا الۡقُرۡاٰنِ فَمَا وَجَدۡتُّمۡ فِیۡهِ مِنۡ حَلَالٍ فَاَحِلُّوۡهُ وَمَا وَجَدۡتُّمۡ فِیۡهِ مِنۡ حَرَامٍ فَحَرِّمُوۡهُ۔[1]

"(حضرت مقدام بن معدیکرب راوی ہیں) رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا یاد رکھو مجھے خدا کی کتاب بھی دی گئی ہے اور اس کی مثل (سنت) بھی اس کے ساتھ عطا ہوئی ہے خبردار! عنقریب کچھ شکم سیر مزین تختوں کی ٹیک لگا کر کہیں گے صرف قرآن کو لازم پکڑو، اس میں جو حلال ہو اسے حلال سمجھو اور جو حرام ہو اسے حرام جانو"۔

اس حدیث پاک کے اقتباس سے یہ باتیں واضح ہو جاتی ہیں:

(۱) سنتِ رسول بھی خدا کی کتاب کی طرح حجتِ شرعیہ ہے۔

---

[1] سنن ابی داؤد، ج ۲: ص ۶۳۲۔

(۲) کتاب کی طرح سنت بھی پیغمبر علیہ السلام کو خدا کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔

(۳) جس طرح قرآن حکیم میں حلال وحرام کا بیان ہے اسی طرح سنتِ رسول میں بھی۔

قرآن حکیم کی تحلیل وتحریم پر ایمان لانا جس طرح ضروری ہے اسی طرح سنتِ رسول علیہ السلام نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، انہیں حرام جاننا بھی ضروری ہے۔ مثلاً شکار کرنے والے درندہ جانوروں اور پرندوں کو حدیث پاک میں حرام[1] قرار دیا گیا ہے اسی طرح گدھے کی حرمت حدیث پاک میں مذکور ہے، قرآن پاک میں نہیں، ان چیزوں کو سنتِ رسول کی روشنی میں حرام ماننا ہوگا۔

(۴) اس حدیث پاک میں ان لوگوں کے بارے میں بھی واضح پیش گوئی پائی جاتی ہے جو شکم سیری اور آرام پرستی کی بنا پر حدیث کی حجیت کا انکار کریں گے اور صرف قرآن، قرآن کی رٹ لگائیں گے۔ غرضیکہ قرآن وحدیث کی روشنی میں رسولِ اکرم ﷺ کے تشریعی اختیارات ثابت ہیں، یہ اختیارات آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئے ہیں، ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے سنن کی پیروی اپنے اوپر لازم کرلیں، امام شافعی رضی اللہ عنہ نے کیا خوب فرمایا ہے:

---

[1] سنن ابی داؤد، ج ۲ : ص ۵۳۳۔

وَمَاسَنَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِیْمَا لَیْسَ فِیْهِ حُکْمٌ فَبِحُکْمِ اللّٰهِ وَکَذٰلِکَ اَخْبَرَنَا اللّٰهُ فِیْ قَوْلِهٖ وَاِنَّکَ لَتَهْدِیْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ صِرَاطِ اللّٰهِ وَقَدْ سَنَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَعَ کِتَابِ اللّٰهِ وَسَنَّ فِیْمَا لَیْسَ فِیْهِ بِعَیْنِهٖ نَصُّ کِتَابٍ وَکُلُّ مَا سَنَّ فَقَدْ اَلْزَمَنَا اللّٰهُ اِتِّبَاعَهٗ وَجَعَلَ فِیْ اِتِّبَاعِهٖ طَاعَتَهٗ وَفِی الْعُنُوْدِ عَنْ اِتِّبَاعِهٖ مَعْصِیَةً اَلَّتِیْ لَمْ یَعْذِرْ بِهَا خَلْقًا وَلَمْ یَجْعَلْ لَهٗ مِنْ اِتِّبَاعِ سُنَنِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مَخْرَجًا۔ [۱]

”رسول پاک ﷺ نے جو کچھ مسنون فرمایا ہے وہ اللہ کے حکم سے ہی مسنون فرمایا ہے چاہے صراحۃً کتابِ الٰہی میں وہ حکم نہ ہو، اس لئے اللہ تعالیٰ نے خبر دیتے ہوئے فرمایا کہ آپ اس صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی فرماتے ہیں جو خدا کی راہ ہے، رسولِ خدا ﷺ نے کتابُ اللہ کی تائید میں بھی بیان فرمایا اور ان امور کے بارے میں بھی طریقہ مقرر فرمایا جن کے بارے میں کتابُ اللہ میں بعینہٖ نص موجود نہیں، رسولِ اکرم ﷺ نے جو کچھ بھی اپنی سنت کی روشنی میں فرمایا ہم پر اس کی پیروی کرنا لازم ہے، حضور ﷺ کی پیروی کو خدا نے اپنی اطاعت اور آپ کی پیروی سے انحراف کو خدا نے اپنی معصیت قرار دیا ہے اس بارے میں کسی مخلوق کا عذر قابلِ پذیرائی قرار نہیں دیا اور کسی کے لئے بھی اتباعِ رسول کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں چھوڑا“۔

---

[۱] الرسالۃ (للشافعی)، ص ۸۸۔

شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تشریعی کام پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ نے عبادات، معاملات اور ملکی قوانین کے بارے میں اپنے فریضہء تشریع کو جس کمال سے پورا فرمایا ہے وہ آپ کا معجزانہ کارنامہ ہے اور اگر پیغمبرِ اقدس ﷺ کے اس شاہکار کو درمیان سے ہٹا دیا جائے تو پھر قرآن پر عمل کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

عصر حاضر کے بعض ''روشن دماغوں'' کو یہاں پر شبہ لاحق ہوا ہے کہ کیا کتاب اللہ نامکمل اور ناکافی ہے کہ جب تک سنت وحدیث کو ساتھ نہ ملایا جائے اس کی تکمیل نہیں ہوتی اور اگر کتاب اللہ قانون سازی کے لئے خود ہی کافی ہے تو پھر سنت کو تشریعی مأخذ اور حجتِ شرعیہ قرار دینا کیا معنی رکھتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے جو علمِ قانون سے واقفیت نہ رکھنے کی بنا پر پیدا ہوئی ہے دنیا بھر میں یہ قاعدہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ جس کسی کو قانون سازی کا اختیارِ اعلیٰ حاصل ہو وہ اگر ایک مجمل حکم دے کر یا ایک اصول طے کر کے اپنے ماتحت کسی شخص یا ادارے کو اس کی تفصیلات کے بارے میں قواعد وضوابط مرتب کرنے کے اختیارات سونپ دے تو اس فرد یا ادارہ کے مرتب کردہ قواعد وضوابط اصل قانون سے الگ چیز نہیں ہوتے بلکہ اسی کا حصہ ہوتے ہیں اور ذیلی قواعد کہلاتے ہیں، یہ ذیلی قواعد بلاشبہ اصل

قانون سے ملکر اس کی تشکیل و تکمیل کرتے ہیں مگر اس کے یہ معنٰی ہرگز نہیں کہ اصل قانون ناقص ہوتا ہے اور اس طرح ذیلی قواعد سے اس کا نقص دور ہوتا ہے بلکہ اس کے معنٰی یہ ہیں کہ قانون ساز نے اپنے قانون کا بنیادی حصہ خود بیان کیا اور تفصیلی حصہ اپنے ماتحت شخص یا ادارے سے مرتب کرایا۔

اللہ تعالیٰ نے بھی قانون سازی میں کچھ اس قسم کا طریق کار اختیار فرمایا ہے، اس نے قرآنِ مجید میں مجمل و مختصر احکام اور ہدایات دے کر یا کچھ اصول بیان کر کے یا اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار کر کے یہ کام اپنے رسولِ اکرم ﷺ کے سپرد کر دیا کہ وہ نہ صرف لفظی طور پر اس قانون کی تفصیل مرتب کریں بلکہ اسے عملی جامہ پہنا کر دنیا کو دکھلا دیں، چنانچہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کتاب الام میں لکھتے ہیں:

فَرَضَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ فِیْ كِتَابِهٖ مِنْ وَجْهَیْنِ اَحَدُهُمَا اَبَانَ فِیْهِ كَیْفَ فَرَضَ بَعْضَهَا حَتّٰی اسْتَغْنٰی فِیْهِ بِالتَّنْزِیْلِ عَنِ التَّاوِیْلِ وَالْخَبَرِ وَالْاٰخَرُ اَنَّهٗ اَحْكَمَ فَرْضَهٗ بِكِتَابِهٖ وَبَیَّنَ كَیْفَ هُوَ عَلٰی لِسَانِ نَبِیِّهٖ ﷺ ثُمَّ اَثْبَتَ فَرْضَ مَافَرَضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ فِیْ كِتَابِهٖ بِقَوْلِهٖ وَمَااٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَانَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَبِقَوْلِهٖ فَلَاوَرَبِّكَ لَایُؤْمِنُوْنَ وَبِقَوْلِهٖ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ مَعَ غَیْرِ اٰیَةٍ فِی الْقُرْاٰنِ بِهٰذَا الْمَعْنٰی فَمَنْ قَبِلَ عَنْ

رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ فَبِفَرْضِ اللّٰہِ قَبِلَ.[۱]

''قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرائض واحکام دو طرح سے بیان فرمائے ہیں، ایک تو یہ کہ فرض اور اس کی کیفیت کو بھی بیان کر دیا ہے یہاں تک کہ اس تنزیلی حکم کی صراحت کی وجہ سے کسی تاویل یا روایت کی ضرورت نہیں رہی، دوسرا یہ کہ اصل فریضہ کو کتاب اللہ میں محکم کر دیا مگر اس کی کیفیت اور تفصیل کو لسانِ پیغمبر ﷺ پر بیان فرما دیا پھر رسول ﷺ کے فرامین کی اہمیت کو ان آیات کے ذریعے ثابت فرما دیا کہ جو کچھ خدا کا رسول دے لے لو اور جس چیز سے روک دے اس سے رک جاؤ، نیز یہ کہ تیرے رب کی قسم! یہ اس وقت تک مومن نہیں بن سکتے جب تک اپنے تمام نزاعی معاملات میں آپ کو اپنا حکم تسلیم نہ کر لیں اور کہیں یوں ارشاد فرمایا کہ کسی مومن مرد اور مومنہ عورت کے لئے جائز نہیں کہ خدا اور رسول کے فیصلے کے بعد وہ اپنی رائے سے کوئی اور راہ نکالیں، اس کے علاوہ اور کئی آیات میں اس کی اہمیت بیان فرما دی لہٰذا اب جو بھی رسولِ خدا ﷺ کی طرف سے کسی فرض کو قبول کرتا ہے، درحقیقت وہ فرضِ خداوندی ہی کو قبول کرتا ہے''۔

تشریحِ قوانین کا یہ اختیار قرآن کریم کے متن میں صاف موجود ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ. (سورۃ النحل)

---

[۱] کتاب الام، ج ۷: ۲۶۳۔

"ہم نے آپ کی طرف ذکر نازل کیا تا کہ آپ اُن کے سامنے بیان کریں جو کچھ ان کی طرف نازل کیا گیا ہے اور تا کہ وہ غور و فکر سے کام لیں"۔

قرآن کریم کے اس واضح فرمان کے بعد کوئی مسلمان یہ جرأت نہیں کرسکتا کہ وہ رسولِ پاک ﷺ کے تشریعی کام کا انکار کرے اور سنتِ نبوی کو مأخذ قرار دینے میں کسی تردد کا اظہار کرے۔

تشریعی احکام کی چند مثالیں

رسولِ اکرم ﷺ کے تشریعی کام کی تفصیل تو اس مقالے میں ناممکن ہے البتہ ہم چند مثالوں سے اس کی وضاحت کرتے ہیں:

(۱) قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ وہ پاکیزگی کو پسند کرتا ہے اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ. ترجمہ: اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور پاکی رکھنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ اپنے محبوب ﷺ کو ہدایت فرمائی وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (اپنے لباس کو پاک صاف رکھیے) حضور اکرم ﷺ نے اس منشاءِ خداوندی پر عمل کرتے ہوئے طہارتِ جسم ولباس کے متعلق تفصیلی ہدایات دیں جو کتبِ حدیث اور کتبِ فقہ میں پوری شرح وسط کے ساتھ موجود ہیں۔

(۲) قرآنِ کریم نے حکم دیا وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا. (اگر تم جنبی ہو تو اچھی طرح پاکیزگی حاصل کرو) نبی کریم ﷺ نے تفصیل سے بتایا کہ

جنابت سے کیا مراد ہے اس کا اطلاق کن حالتوں پر ہوتا ہے، جنابت سے پاکیزگی حاصل کرنے کے لئے غسل کس طرح کیا جائے وغیرہ۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ جب تم نماز کے لئے اٹھو تو اپنا منہ دھولو، کہنیوں تک ہاتھ دھوؤ، سر پر مسح کرو اور پاؤں دھولو، نبی کریم ﷺ نے بتایا کہ منہ دھونے کے ساتھ ساتھ کلی کرنا اور ناک میں پانی بھی ڈالنا چاہیے یہ بھی فرمایا کہ کان، سر کا حصہ ہیں، کانوں پر بھی مسح کرنا چاہیے، نیز یہ کہ پاؤں میں موزے ہوں تو ان پر بھی مسح کیا جائے ساتھ ہی یہ بھی وضاحت کر دی کہ وہ کون سے امور ہیں جن سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

(۴) قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ (نماز قائم کرو!) حضور نبی کریم ﷺ نے نماز کی پوری ہیئت مختلف ارکان اور اذکار کی مکمل وضاحت فرمائی، اوقات کی تعیین فرمائی اور تمام لوازمات کا بیان شافی فرمایا۔

(۵) قرآن پاک نے کھانے پینے کی چیزوں میں چند اشیاً کے حرام ہونے کی تصریح کی مثلاً میتہ، دمِ مسفوح، لحمِ خنزیر اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کی ہوئی چیز، اس کی مزید تفصیل حضور ﷺ نے اپنے قول و عمل سے فرمائی اور کئی ایسی چیزوں کی حرمت بیان فرمائی جن سے قرآن مجید ساکت ہے مثلاً شکار کرنیوالے درندے اور پرندے وغیرہ۔

(۶) قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے وراثت کا قانون بیان کرتے

ہوئے فرمایا اگر میت کی نرینہ اولاد نہ ہو اور صرف ایک لڑکی ہو تو نصف ترکہ پائے گی، دو سے زائد لڑکیاں ہوں تو انہیں ترکے کا دو تہائی حصہ ملے گا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے وضاحت فرمادی کہ اگر دو ہوں تو انہیں بھی دو تہائی حصہ ملے گا۔

قرآن پاک نے قانونِ وراثت بیان فرمایا، رسولِ خدا ﷺ نے اس سے استثناء کرتے ہوئے فرمایا **لَا يَرِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ وَلَا الْكَافِرُ الْمُسْلِمَ**[1] (مسلمان کافر کا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوسکتا) اسی طرح میراث سے متعلق بہت سے مسائل بیان فرمائے۔

(۷) قرآن پاک نے عمومی طور پر قانونِ وصیت بیان فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی استثنائی صورت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وارث کے لئے وصیت نہیں ہوسکتی [2] قرآنِ پاک میں وصیت کی آخری حد بیان نہیں کی گئی، رسولِ اکرم ﷺ نے بتادیا کہ اس کی آخری حد ترکے کا تہائی حصہ ہے۔ [3]

(۸) قرآنِ پاک نے محرماتِ نسبیہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ دو بہنیں ایک ساتھ نکاح میں نہ رکھو، رسولِ خدا ﷺ نے اس کے ساتھ یہ اضافہ بھی فرمایا کہ پھوپھی اور بھتیجی نیز خالہ اور بھانجی کو ایک ساتھ نکاح

---

[1] صحیح مسلم شریف، ج ۲: ص ۳۳۔ [2] سنن نسائی، ج ۲: ص ۱۱۴۔ ایضاً نصب الرایۃ ج ۴: ص ۳۰۴۔

[3] صحیح مسلم شریف، ج ۲: ۴۰۔

میں رکھنا حرام ہے۔ [۱]

(۹) قرآنِ پاک نے محرماتِ رضاعیہ، رضاعی ماں اور بہن کا ذکر فرمایا، حضور ﷺ نے اس بارے میں عمومی ضابطہ بیان فرمادیا کہ:

یَحْرُمُ مِنَ الرِّضَاعَةِ مَایَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ.

"رضاعت سے وہ رشتے حرام ہوجاتے ہیں جو نسب کی بناپر حرام ہیں"۔

(۱۰) قرآنِ پاک نے بیع وشراء کے بارے میں فرمایا کہ لین دین باہمی رضامندی سے ہونا چاہیے، رسولِ خدا ﷺ نے بیع کے مسائل (مزابنہ، محاقلہ وغیرہ) کا فساد اور بیعِ سلم وغیرہ کا جواز تفصیل سے بیان فرمایا۔

(۱۱) قرآنِ کریم نے رِبوا کی حرمت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا

"اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے"۔

حضورِ اکرم ﷺ نے اس کی پوری وضاحت فرمادی، چھ چیزوں کا نام لے کر فرمایا کہ یہ دست بدست اور ہموزن ہونی چاہییں، ان میں کمی بیشی حرام ہے، اس کے علاوہ حجۃ الوداع کے موقع پر حضور ﷺ نے سودی لین دین کالعدم قرار دیا اور عملی طور پر سب سے پہلے اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کے سودی تقاضوں کی قطعی نفی فرمادی۔ [۲]

---

[۱] صحیح مسلم، ج ۱: ص ۴۵۲۔

[۲] سنن ابی داود، ج ۱: ۳۶۳۔

غرضیکہ آپ نظامِ حیات کے کسی گوشہ کو لیں، اس بارے میں نبی کریم ﷺ کی ہدایات آپ کی رہنمائی کریں گی اور آپ کو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑیگا کہ رسولِ اکرم ﷺ کی سنت وحدیث سے قطع نظر کر کے اسلامی آئین مکمل نہیں ہوسکتا۔ یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ حضور ﷺ نے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ آپ کی ذاتی رائے تھی اور اسی زمانہ کے حالات کے مطابق ایک موزوں تجویز تھی، اب اس میں مرورِ زمانہ کے ساتھ تبدیلی کرنا جائز ہے اور یہ تبدیلی بھی سنت کا جز ہے جیسا کہ عصرِ حاضر کے بعض تجدد پسند مفکر خیال کرتے ہیں۔

سنت کے بارے میں اُن کا یہ نظریہ حقیقت اور صداقت سے بالکل بعید ہے، اس بارے میں حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ نے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ مامور من اللہ ہو کر فرمایا قرآن مجید گواہی دیتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں فرماتے، وہ تو نہیں مگر وحی جو اُن کی طرف کی جاتی ہے۔ [1]

حضور اکرم ﷺ خود بھی فرماتے ہیں کہ میرے دہنِ مبارک سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ [2]

اہل علم اور اہل دل حضرات کا اتفاق ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی سنت وحدیث آپ کی رائے کا نام نہیں بلکہ وحیِ الٰہی کا نام ہے جسے ہم وحیِ خفی اور

---

[1] سورۂ والنجم، ایت ۳، ۴۔

[2] سنن ابی داؤد، کتاب العلم، ج ۲ : ص ۵۱۴۔

وحیِ غیر متلو سے تعبیر کرتے ہیں اور جس طرح حضور ﷺ کی بعثت قیامت تک کے لئے ہے ایسے ہی آپ کی سنت بھی قیامِ قیامت تک کے لئے حجت ہے اور اسلامی قوانین کا دوسرا سرچشمہ ہے۔

سنت وحیِ الٰہی ہے

ہم ابھی کہہ آئے ہیں کہ سنت بھی قرآن کی طرح وحی ہے، فرق یہ ہے کہ قرآن وحیِ متلو ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے، اسے وحیِ جلی بھی کہتے ہیں لیکن سنت وحیِ خفی اور غیر متلو ہے، قرآنِ مجید میں الفاظ کا اِلقاء اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے لیکن سنت وحدیث میں ایسا نہیں بلکہ مطالب، رسول اللہ ﷺ کے دل میں اِلقاء کردیئے گئے جنہیں آپ نے اپنے الفاظ میں بیان کیا اس لئے ہم قرآن کو کلامِ معجز اور کلامِ مُنزَّل کہتے ہیں جب کہ سنت کو غیر معجز اور کلامِ رسول کہتے ہیں، امامِ غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

لَيْسَ لَهُ كَلَامَانِ اَحَدُهُمَا قُرْاٰنٌ وَالْاٰخَرُ لَيْسَ بِقُرْاٰنٍ وَاِنَّمَا الْاِخْتِلَافُ فِي الْعِبَارَاتِ فَرُبَمَا دَلَّ عَلٰى كَلَامِهٖ بِلَفْظٍ مَّنْظُوْمٍ يَّاْمُرُنَا بِتِلَاوَتِهٖ فَيُسَمّٰى قُرْاٰنًا وَرُبَمَا دَلَّ بِغَيْرِ لَفْظٍ مَّتْلُوٍّ فَيُسَمّٰى سُنَّةً [1]

”اصل میں دو کلام نہیں جن میں ایک قرآن ہو اور دوسرا غیر قرآن،

---

[1] المستصفیٰ، ج ۱: ص ۸۰۔

یہ عبارت کا اختلاف ہے، اگر اللہ تعالیٰ اپنے کلام پر لفظِ عموم سے دلالت فرمائے اس کی تلاوت کا امر فرمائے تو اسے قرآن کہا جائے گا اور الفاظِ متلو کے بغیر دلالت کی جائے تو اسے سنت کا نام دیا جائے گا"۔

بعض معاصرین کا خیال ہے کہ حضور ﷺ پر صرف بصورت قرآن ہی وحی نازل ہوتی تھی اور سنت کے وحیِ الٰہی ہونے کا کوئی ثبوت کم از کم قرآن میں تو نہیں ملتا، ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ حضور خاتم النبیین ﷺ کی سنت کے وحیِ الٰہی ہونے کو قرآن مجید کی روشنی میں ثابت کریں۔

سنت کے وحیِ الٰہی ہونے پر دلائل

قرآن مجید کو بغور پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاءِ کرام علیہم السلام کو کتاب کے ساتھ حکمت بھی عطا ہوتی ہے چنانچہ تیسرے پارے میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتَابٍ وَّحِکْمَۃٍ ثُمَّ جَآئَکُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنْصُرُنَّہٗ۔ (ال عمران ایت ۸۱)

"یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ میں تم کو کتاب اور حکمت دوں، پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول جو تمہاری کتابوں کی تصدیق کرے تو ضرور ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور ضرور اس کی مدد کرنا"۔

اس میں صاف تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء کرام کو کتاب وحکمت دونوں عطا فرماتا ہے چنانچہ رسولِ اکرم ﷺ پر خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے اس کا ثبوت اس آیت سے ملتا ہے:

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَیْکَ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ وَعَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ وَکَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْکَ عَظِیْمًا. (سورۂ نساء ایت ۱۱۳)

"اللہ تعالیٰ نے تم پر کتاب اور حکمت اتاری اور تمہیں سکھا دیا جو کچھ تم نہ جانتے تھے اور اللہ کا تم پر بڑا فضل ہے"۔

سورۂ آل عمران میں بعثت نبوی کے مقاصد بیان کرتے ہوئے فرمایا:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ. (ال عمران ایت ۱۶۴)

"بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنین پر بڑا احسان کیا ہے کہ ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے، انہیں پاک صاف کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت سکھاتا ہے"۔

اسی طرح سورہ احزاب میں امہات المؤمنین کو خطاب کر کے فرمایا؛

وَاذْکُرْنَ مَا یُتْلٰى فِیْ بُیُوْتِکُنَّ مِنْ اٰیَاتِ اللّٰهِ وَالْحِکْمَةَ.

(الاحزاب ایت ۳۴)

"یاد کرو جو تمہارے گھروں میں تلاوت کی جاتی ہیں اللہ کی آیتیں اور حکمت"۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ حکمت کونسی چیز ہے جس کا ذکر بار بار کتاب کے ساتھ کیا گیا ہے۔

لفظِ حکمت کا مفہوم

فنِ لغت کے امام راغب اصفہانی نے مفردات میں بیان کیا ہے کہ حکمت کا مادہ حکم ہے اور حکم کے معنٰی ہیں منع کرنا حَکَمَ اَیْ مَنَعَ مَنْعاً لِلْاِصْلَاحِ یعنی اصلاح کے لئے کسی کو کسی امر سے باز رکھنا اسی لئے لگام کو بھی حکمت کہتے ہیں کیونکہ وہ گھوڑے کو سرکشی سے روکتا ہے اسی مناسبت سے کہتے ہیں اَلْحِکْمَۃُ وَضْعُ الْاَشْیَاءِ فِیْ مَحَلِّھَا یعنی اشیاء کو اپنے صحیح محل پر رکھنا اور غیر صحیح محل میں استعمال نہ کرنا۔

علامہ مرتضٰی زبیدی نے تاج العروس میں مزید تحقیق کرتے ہوئے لکھا ہے:

اَلْحِکْمَۃُ الْعَدْلُ فِی الْقَضَاءِ وِالْعِلْمُ بِحَقَائِقِ الْاَشْیَاءِ عَلٰی مَا ھِیَ عَلَیْہِ وَالْعَمَلُ بِمُقْتَضَاہُ وَلِھٰذَا انْقَسَمَتْ اِلٰی عِلْمِیَّۃٍ وَعَمَلِیَّتِہ۔[1]

---

[1] تاج العروس، فصل الحاء من باب المیم۔

”کسی جھگڑے کا فیصلہ کرتے وقت عدل کرنے کو حکمت کہتے ہیں اور اشیاء کی اصل حقیقت کو جان لینا اور اس کے مقتضا پر عمل کرنا بھی حکمت کہلاتا ہے۔ اس کی دو قسمیں بیان کی جاتی ہیں ”حکمتِ عملی اور حکمت علمی“۔

لغوی مفہوم واضح ہو جانے کے بعد اب ان قرآنی آیات پر غور کرنا ہے جہاں کتاب و حکمت کو ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے ان آیات میں لفظ حکمت سے مقصود حکمت کتاب ہے، کتبِ مُنزّلہ میں جو اوامر و نواہی، احکامات و ارشادات، وعد و وعید اور پند و موعظت مذکور ہو، ان کی ماہیت و حقیقت کا صحیح علم اللہ تعالیٰ ہر پیغمبر کو عطا فرماتا ہے اسی طرح رحمتِ دو عالم ﷺ کو بھی کتاب اللہ کا صحیح علم و عمل اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا اور یہی حضور ﷺ کا علم و عمل ہے جسے ہم سنتِ نبوی سے تعبیر کرتے ہیں چاہے کوئی اسے حکمتِ نبوی سے تعبیر کرے یا سنتِ نبوی سے دونوں صورتوں میں مصداق واحد ہے۔

۔ عِبَارَاتُنَا شَتّٰی وَحُسْنُکَ وَاحِدٌ

حکمت جب بصورتِ وحی، خدا کی طرف سے نازل شدہ ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ سنت بھی وحیِ الٰہی اور منزل من اللہ ہے، حکمت سے سنت نبوی مراد لینے میں ہم منفرد نہیں بلکہ بہت سے جلیل القدر ائمہ نے یہی قول اختیار کیا ہے چنانچہ حافظ مغرب یوسف بن عبدالبر نے اپنی سند کے ساتھ حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے:

عَنْ قَتَادَۃَ فِیْ قَوْلِہٖ عَزَّوَجَلَّ وَاذْکُرْنَ مَایُتْلٰی فِیْ بُیُوْتِکُنَّ مِنْ اٰیَاتِ اللّٰہِ وَالْحِکْمَۃِ قَالَ مِنَ الْقُرْاٰنِ وَالسُّنَّۃِ قَالَ اَبُوْعَمْرٍو کَذَالِکَ رَوَاہُ مُحَمَّدُ بْنُ ثَوْرٍ وَابْنُ الْمُبَارَکِ عَنْ مَعْمَرٍ عَنْ قَتَادَۃَ۔ [1]

”محمد بن ثور اور عبداللہ بن مبارک نے معمر کے واسطے سے قتادہ (جلیل القدر تابعی مفسر) سے روایت کیا ہے کہ سورۂ احزاب کی محولہ بالا آیت میں حکمت سے مراد سنت ہے“۔

امام شافعی نے بھی حکمت سے سنت کا مفہوم مراد لیا ہے چنانچہ الرسالہ میں لکھتے ہیں:

سَمِعْتُ مَنْ اَرْضٰی مِنْ اَھْلِ الْعِلْمِ بِالْقُرْاٰنِ یَقُوْلُ اَلْحِکْمَۃُ سُنَّۃُ رَسُوْلِ اللّٰہِ۔ [2]

”میں نے پسندیدہ اہل علم حضرات سے سنا ہے کہ حکمت سے مراد سنت رسول اللہ ﷺ ہے“۔

اسی مفہوم کو صحیح قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

فَلَمْ یَجُزْ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ اَنْ یُقَالَ الْحِکْمَۃُ ھٰھُنَا اِلَّا سُنَّۃُ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ۔

---

[1] جامع بیان العلم، ج۱: ص۱۷۔

[2] الرسالۃ (للشافعی) ۷۸۔

"یہاں پر سوائے حکمت کو سنت قرار دینے کے اور مفہوم مراد لینا جائز نہیں"۔

چونکہ یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ تلاوت تو کتاب کی ہوتی ہے، سنت کے لئے لفظ تلاوت استعمال کرنے کی کیا توجیہ ہوسکتی ہے، امام شافعی فرماتے ہیں کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں تلاوت کا معنٰی مطلقاً پڑھ لینا یا زبان سے ادا کرلینا تھا نہ کہ قرأتِ متواترہ کی تلاوت کرنا چنانچہ کتاب الام میں فرماتے ہیں:

قَالَ فَهٰذَا الْقُرْاٰنُ يُتْلٰى فَكَيْفَ تُتْلَى الْحِكْمَةُ قُلْتُ اِنَّمَا مَعْنَى التِّلَاوَةِ اَنْ يُّنْطَقَ بِالْقُرْاٰنِ وَالسُّنَّةِ.[1]

"اگر کوئی یہ کہے کہ قرآن کی تلاوت ہوتی ہے پس حکمت کی تلاوت کے کیا معنٰی ہیں؟ میں کہتا ہوں تلاوت کے معنٰی ہیں کہ قرآن وسنت کے ساتھ نطق کیا جائے"۔

مشہور مؤرخ اور مفسر حافظ ابن کثیر دمشقی فرماتے ہیں:

اَلْحِكْمَةُ هِيَ السُّنَّةُ وَذٰلِكَ لِاَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى ذَكَرَ تِلَاوَةَ الْكِتَابِ وَتَعْلِيْمَهٗ ثُمَّ عَطَفَ عَلَيْهِ الْحِكْمَةَ فَوَجَبَ اَنْ يَّكُوْنَ الْمُرَادُ شَيْئًا اٰخَرَ وَلَيْسَ ذٰلِكَ اِلَّا السُّنَّةَ.[2]

"حکمت سے مراد سنت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تلاوت و تعلیم

---

[1] کتاب الام (للشافعی)، ج ۷: ۲۵۱۔

[2] تفسیر ابن کثیر، ج ۱: ۱۱۲۔

کتاب پر حکمت کو معطوف کیا، اس لئے یہاں پر حکمت سے مراد کتاب کے علاوہ کوئی دوسری چیز ہے اور یہ سنت ہی ہے"۔

کتاب کے ساتھ حکمت وسنت نازل کرنے کی حکمت

کتاب کے ساتھ حکمت وسنت نازل کرنے کی وجہ دین کو اہل خرد کی موشگافیوں سے محفوظ رکھنا تھا کیونکہ اگر کتاب اللہ کے احکام کی تشریح اور مطالب کا تعین عقل انسانی کے سپرد ہوتو پھر احکامِ الٰہیہ اہل خرد کی موشگافیوں کا نشانہ بن کر رہ جائیں گے اور ہر شخص اپنی صوابدید کے مطابق علیحدہ علیحدہ تعبیر وتشریح شروع کر دے گا جس کے نتیجے میں اُمت کے اندر تشتت وافتراق کو مزید ہوا ملے گی۔

تعبیرِ حکمت پر ایک اشکال کا جواب

حکمت سے سنت مراد لینے پر یہ اشکال وارد ہوسکتا ہے کہ یہ تب درست ہے جب حکمت انبیاء کرام کا خاصہ ہو اور کوئی غیر نبی حکمت کا حامل نہ ہو حالانکہ نصوصِ قرآن میں صراحت ملتی ہے کہ حکمت غیر انبیاء کو بھی دی جاتی ہے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

يُؤْتِى الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِىَ خَيْرًا كَثِيْرًا۔

"اللہ تعالیٰ جسے چاہے حکمت عطا کرتا ہے اور جسے حکمت دی گئی

ہے اسے خیر کثیر دی گئی"۔

جواباً عرض ہے کہ ہم اس حکمت سے سنت مراد لیتے ہیں جو کتاب کے ساتھ انبیاءِ کرام کو عطا کی جاتی ہے یہ حکمت اس حکمت سے جداگانہ چیز ہے جو غیر انبیاء کو بھی عطا کی جاتی ہے۔ ان دونوں حکمتوں میں واضح فرق یہ ہے کہ انبیاء کی حکمت خدا کی طرف سے نازل ہوتی ہے جیسا کہ گذشتہ آیات سے ثابت ہو چکا ہے لیکن غیر نبی کی حکمت وہ خصوصی ملکہ ہے جس کی مدد سے غور و فکر کے ذریعہ حقائق کائنات سے بقدر طاقتِ بشریہ آگاہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ حکمت انبیاء میں غلطی کا وقوع ناممکن ہے جب کہ غیر انبیاء کرام کی حکمت مین نہ صرف ممکن بلکہ واقع ہے، اگر کوئی اس فرق کو تسلیم نہ کرے اور انبیاءِ کرام کی حکمت سے بھی ملکہ اور استعداد مراد لے تو پھر اسے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ انبیاءِ کرام خصوصاً سید الانبیاء ﷺ کو حکمت کا عطا ہونا نص قرآنی میں صراحت کے ساتھ ثابت ہے لیکن غیر انبیاء کے بارے میں تصریح نہیں ملتی کہ فلاں فلاں کو حکمت سے نوازا گیا۔ اب یہ کیسے پتا چلے کہ فلاں فلاں شخص کو واقعۃً حکمت عطا کی گئی ہے اور اسے اس خیر کثیر سے نوازا گیا ہے جس کے ساتھ دین و دنیا کی فلاح وابستہ ہے۔

ظاہر ہے کہ اس بارے میں حکمت نبوی ہی معیار ہو سکتی ہے کیونکہ ہم صرف نبی کریم ﷺ کے متعلق یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ

صاحب حکمت ہیں لہٰذا جس حکیم کی حکمت، حکمتِ نبوی سے ہم آہنگ ہوگی وہ خیر کثیر کا حامل ہوگا ورنہ نہیں، یہ ایسا ہی ہے کہ رؤیا صالحہ کو نبوت کا چھیالیسواں حصہ قرار دیا گیا ہے۔ [1]

ظاہر ہے کہ ہر شخص کے خواب کو یہ درجہ نہیں دیا جا سکتا، یہاں بھی اُنہی لوگوں کے سچے خواب مراد ہونگے جو اتباعِ شریعت اور محبتِ رسول علیہ السلام میں امتیازی مقام رکھتے ہیں ان کی خواب کو فیضانِ نبوت کی جز قرار دیا جائے گا نہ کہ نفسِ نبوت کی، اسی طرح غیر نبی کے اجتہاد کا مسئلہ ہے۔ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اجتہاد کو وحیِ خفی [2] سے تعبیر کیا گیا ہے مگر دوسرے مجتہدین کو یہ حیثیت قطعاً حاصل نہیں، غیر نبی کا وہی اجتہاد مستند ہوگا جو کتاب وسنت کی روشنی میں کیا گیا ہو اور وہ اجتہاد کرنے والا اُن شرائطِ اجتہاد کے ساتھ موصوف ہو جو مجتہد کے لئے ضروری ہیں، غیر نبی سے اگر اجتہاد میں خطا ہو تو وہ عمر بھر اسی خطا پر مصر رہ سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ اپنے انبیاءِ کرام کی خصوصی حفاظت فرماتا ہے لہٰذا اُن کا کسی اجتہاد پر قائم رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ اجتہاد خدا تعالیٰ کو بھی پسند ہے اور امت کے لئے حکم شرعی کا مثبت ہے۔ [3]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ سنتِ نبوی اور حکمتِ نبوی، ایک حقیقت کی دو تعبیریں ہیں، حکمتِ نبوی ہی حجتِ شرعیہ ہے اور اس ”میزان منزل“ کا مصداق ہے جس کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

---

[1] صحیح مسلم شریف، ج۲: ص۲۴۱۔ [2] مسلم الثبوت، ۲۷۸۔ [3] حسامی، ۹۲۔

وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ. (الحدید ایت ۲۵)

ہم نے آپ پر کتاب اور میزان کو نازل کیا تا کہ لوگ انصاف کے ساتھ قائم رہیں۔

ظاہر ہے کہ یہاں میزان سے مراد حسی ترازو نہیں اور نہ ہی کتاب کے ساتھ اس کی کوئی مناسبت ہے، یہاں میزان سنت ہی کی طرف اشارہ ہے جو کتاب کے ساتھ نازل ہوئی ہے اور حق و باطل کو پرکھنے کے لئے معیار شرعی کی حیثیت رکھتی ہے علماءِ حق شروع ہی سے اس حقیقت کو تسلیم کرتے آئے ہیں کہ سنت بھی وحیِ الٰہی ہے مگر اب کچھ لوگوں نے (جو اپنے آپ کو غالباً فہم قرآن کے اجارہ دار سمجھتے ہیں) یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ حضور ﷺ پر صرف ایک قسم کی وحی بصورت قرآن اُترتی تھی جو ہمارے سامنے محفوظ و موجود ہے، اس کے سوا کسی اور قسم کی وحی ثابت نہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وحی کے مفہوم کی تحقیق اور قرآنی روشنی میں اس پر تبصرہ کیا جائے۔

وحی کیا ہے

مفرداتِ قرآنی کی تحقیق کرنے والے مشہور فاضل علامہ راغب اصفہانی تحریر کرتے ہیں:

(اَلْوَحْیُ) اَصْلُ الْوَحْيِ الْاِشَارَةُ السَّرِيْعَةُ وَلِتَضَمُّنِ السُّرْعَةِ قِيْلَ اَمْرٌ وَحْيٌ وَذٰلِکَ يَكُوْنُ بِالْكَلَامِ عَلٰی سَبِيْلِ الرَّمْزِ وَالتَّعْرِيْضِ وَقَدْ يَكُوْنُ بِصَوْتٍ مُجَرَّدٍ عَنِ التَّرْكِيْبِ وَبِاِشَارَةِ بِبَعْضِ الْجَوَارِحِ وَبِالْكِتَابَةِ وَقَدْ حُمِلَ عَلٰی ذٰلِکَ قَوْلُهٗ تَعَالٰی عَنْ زَكَرِيَّا فَاَوْحٰی اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّعَشِيًّا فَقَدْ قِيْلَ رَمْزٌ وَيُقَالُ لِلْكَلِمَةِ الْاَلٰهِيَةِ الَّتِيْ تُلْقٰی اِلٰی اَنْبِيَائِهٖ وَحْيٌ وَذٰلِکَ اَضْرُبٌ جِسْمًا دَلَّ عَلَيْهِ قَوْلُهٗ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْمِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ الاية ۱؎

”وحی کا اصل معنیٰ تیزی سے اشارہ کرنا ہے اور اسی سرعت کے مفہوم کی بنا پر کہا جاتا ہے امرٌ وحیٌّ (تیزی والا امر) اور یہ اشارہ سریعہ کبھی اشارہ و کنایہ والی گفتگو سے ہوتا ہے کبھی ایسی آواز سے جس میں ترکیب لفظی نہ پائی جائے، کبھی اعضاء کے اشارہ سے اور کبھی لکھنے سے حضرت زکریا علیہ السلام کا ارشاد فَاَوْحٰی اِلَیْهِمْ پس زکریا علیہ السلام نے ان کی طرف اشارہ کیا کہ صبح کو اور زوال کے بعد خدا کی تسبیح کیا کرو، کہا جاتا ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے رمز و اشارہ سے کام لیا تھا اور وحی کا اطلاق اس کلمہ خداوندی پر بھی کیا جاتا ہے جو انبیاءِ کرام اور اولیاء عظام کو القاء کیا جاتا ہے اور اس کی کئی قسمیں ہیں جو آیۃ وَمَا کَانَ لِبَشَرٍ (الآیۃ) میں بیان کی گئی ہے“۔

علامہ عبد العظیم زرقانی وحی کا شرعی مفہوم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اَمَّا الْوَحْیُ فَمَعْنَاهُ فِیْ لِسَانِ الشَّرْعِ اَنْ یُّعَلِّمَ اللّٰهُ مَنِ اصْطَفَاهُ مِنْ عِبَادِهٖ كُلَّ مَآ اَرَادَ اِطْلَاعَهٗ عَلَيْهِ مِنْ اَلْوَانِ الْهِدَايَةِ وَالْعِلْمِ وَلٰكِنْ بِطَرِيْقَةٍ سِرِّيَّةٍ خَفِيَّةٍ غَيْرِ مُعْتَادَةٍ لِلْبَشَرِ۔[1]

"وحی کا شرعی مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ بندوں میں سے جسے چاہے مختلف اقسام کے علومِ ہدایت سے مطلع کرے لیکن پوشیدہ رازدارانہ طریقے سے جو بشری طریق معتاد کے خلاف ہو"۔

اس وحی کی قرآن کریم نے حسبِ ذیل تین صورتیں بیان کی ہیں چنانچہ سورہ شوریٰ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ۔

(سورۃ الشوریٰ، ایت ۵۱)

کسی بشر کیلئے نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کے ایک خاص طریقے سے یا پردے کے پیچھے سے یا اس طرح کہ ایک قاصد بھیجے اور وہ اللہ کے اذن سے وحی کرے جو کچھ اللہ تعالیٰ چاہتا ہو اور وہ برتر اور دانا ہے۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر احکام و ہدایات نازل کرنے کی تین صورتیں بتائی ہیں ایک القاء والہام، چنانچہ علامہ قرطبی نے وحیا کی تشریح

---

[1] مناہل العرفان فی علوم القرآن، ج ۱ : ص ۵۶۔

میں حضرت مجاہد سے نقل کیا ہے:

قَالَ مُجَاهِدٌ نَفَثَ يَنْفُثُ فِيْ قَلْبِهٖ فَيَكُوْنُ اِلْهَامًا وَمِنْهُ قَوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِيْ رَوْعِيْ اَنَّ نَفْسًا لَنْ تَمُوْتَ حَتّٰى تَسْتَكْمِلَ رِزْقَهَا وَاَجَلَهَا فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاجْمَلُوْا فِي الطَّلَبِ خُذُوْا مَاحَلَّ وَدَعُوْا مَاحَرُمَ۔[1]

”یہاں پر وحی سے مراد وہ القاء ہے جو پیغمبر اسلام علیہ السلام کے دل پر کیا جاتا ہے چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا بے شک روح اقدس نے میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے کہ کوئی نفس اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک کہ اپنا رزق اور دنیا میں اپنی مدت عمر پوری نہ کر لے پس اللہ سے ڈرو اور طلب رزق میں عمدگی اور اختصار برتو حلال چیزیں لے لو اور حرام چیزیں چھوڑ دو“۔

غرضیکہ حضرت مجاہد کے اس قول کی روشنی میں یہاں پر وحیاً سے مراد القاء والہام ہے۔

وحی کی دوسری قسم قرآن نے یہ بتائی ہے کہ رب تعالیٰ پردے کے پیچھے کسی سے کلام کرے جیسے موسیٰ علیہ السلام سے گفتگو ہوئی تھی اور تیسری صورت یہ ہے کہ اپنے پیغمبر فرشتے کے ذریعے سے وحی کرے اور اس پر اتفاق ہے کہ قرآنِ مجید میں اسی قسم کی وحی موجود ہے چنانچہ انیسویں پارے

---

[1] تفسیر الجامع لاحکام القرآن (قرطبی)، ج ۱۶: ۵۳۔

میں ارشاد خداوندی ہے:

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ○ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ○ (الشعراء ایت۱۹۲تا۱۹۴)

یہ رب العالمین کی نازل کردہ کتاب ہے جسے روح الامین جبریل علیہ السلام نے آپ کے قلب اقدس پر اتارا ہے تاکہ آپ عذابِ الٰہی سے ڈرانے والوں میں سے ہو جائیں۔

اس سے واضح ہو گیا کہ قرآنِ مجید صرف ایک قسم کے مجموعہ وحی پر مشتمل ہے آسمانی ہدایات وعلوم ملنے کی باقی دو صورتیں (جن کا ذکر سورۃ الشوریٰ کی مذکورہ بالا آیت میں کیا گیا ہے) اس کے علاوہ ہیں۔

اب ہم قرآنِ مجید سے ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ اس وحی متلو کے علاوہ باقی صورتوں سے بھی آپ کو آسمانی ہدایات ملتی تھیں۔

قرآن سے وحیِ خفی کا ثبوت

(۱) سورۂ بقرہ[۱] میں ارشاد ہوتا ہے:

''ہم نے بیت المقدس کو اسلئے قبلہ بنایا تھا تاکہ یہ دیکھیں کہ کون رسول ﷺ کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے''۔

یہاں پر اتباعِ رسول ﷺ سے کسی طرح بھی اتباعِ قرآن مراد نہیں

---

[۱] سورۂ بقرہ، ایت ۱۴۳۔

[۲] صحیح مسلم، ج ۱۲: ۲۲۰۔

لیا جا سکتا اس لئے کہ مسجد حرام سے پہلے جو قبلہ تھا اسے قبلہ بنانے کا حکم قرآنِ پاک میں کہیں نہیں ملتا اس لئے لازمی طور پر ماننا پڑے گا کہ وہ قبلہ وحیِ خفی یعنی سنتِ نبوی کے ذریعے مقرر کیا گیا تھا۔ صحیح مسلم میں حضرت براء بن عازب سے روایت ہے کہ مدینہ منورہ آنے کے سولہ یا سترہ ماہ بعد تحویل قبلہ کا حکم آیا اس عرصہ میں بیت المقدس قبلہ نماز تھا جس کی دلیل سنتِ نبوی کے علاوہ قرآن سے کہیں نہیں ملتی، بعد میں سورۂ بقرۃ میں ارشاد ہوا کہ یہ کلام اس لئے تھا کہ اتباع رسول کرنے والوں اور الٹے پاؤں پھرنے والوں کے درمیان امتیاز ہو جائے۔

اس سے دو باتیں ثابت ہوئیں ایک یہ کہ رسول ﷺ پر قرآن کے علاوہ بھی وحی آتی تھی دوسری یہ کہ رسولِ کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کے ان احکام کی پیروی کرنے پر بھی مامور ہیں جن کا ذکر قرآن میں نہیں۔

(۲) یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ نماز آغاز اسلام میں فرض ہوئی اور ظاہر ہے کہ نماز سے پہلے وضو کیا جاتا تھا لیکن وضو کے بارے میں قرآنی ارشاد سورۂ مائدہ میں ملتا ہے جس کے بارے میں مختلف روایات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نزول تقریباً صلح حدیبیہ سے شروع ہوا اور حجۃ الوداع کے موقع پر اس کا اختتام ہوا۔[۱]

---

[۱] تفسیر ضیاء القرآن، ج ۱: ۱۸۶۔

اس سورت کے نزول سے پہلے حضور ﷺ کا وضو فرمانا اور صحابہ کا آپ کی پیروی کرنا، وحیِ خفی سے نہیں تو اور کس طریقہ سے تھا؟

یہاں پر یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ اگر وحیِ خفی حجت تھی تو پھر قرآن میں سورۂ مائدہ آیت نمبر ۶ میں وضو کا حکم تفصیل سے کیوں دیا گیا؟ معلوم ہوا کہ وحیِ خفی بذاتہٖ حجت نہیں تھی اور نہ قابل اعتبار تھی، اس لئے قرآنِ مجید کی وحیِ متلو سے اس کی توثیق ضروری سمجھی گئی لیکن یہ شبہ بھی کج فہمی کی پیداوار ہے اس لئے اگر وحیِ خفی حجت نہیں تھی، تو پھر تعیین قبلہ، ہیئتِ نماز اور کیفیتِ وضو کے بارے میں قرآنی ہدایات نازل ہونے سے پہلے سالہا سال تک کیوں عمل ہوتا رہا۔

وضو کے بارے میں سورۂ مائدہ میں جو آیت نازل ہوئی اس کا مقصد وحیِ خفی اور سنت کی حجیت کو واضح کرنا ہے اور یہ ثابت کرنا ہے کہ حضور رسولِ اکرم ﷺ قولاً و عملاً جو فرماتے یا کرتے تھے وہ منشاءِ خداوندی کے عین مطابق ہے اور اس کی پیروی بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح قرآنی آیات پر عمل کرنا ضروری ہے۔

(۳) رسولِ اکرم ﷺ نے خواب میں دیکھا [1] کہ تمام مسلمان پُر امن طور پر مسجد حرام میں داخل ہو رہے ہیں، بعض نے سر منڈا رکھے ہیں اور

---

[1] تفسیر خزائن العرفان، ص ۶۱۲۔

بعض نے بال ترشوائے ہوئے ہیں، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صحابہ کو یہ خواب سنایا حضورِ اکرم ﷺ بہت سے مسلمانوں کیساتھ مکہ روانہ ہوئے لیکن حدیبیہ کے مقام پر کفار نے روک لیا، آخر اُن سے صلح ہوئی لیکن اس سال بیت اللہ شریف جانے کی اجازت نہ ملی، مسلمانوں کو واپس آنا پڑا۔ اس موقع پر حضور علیہ السلام اور حضرت عمر ؓ کے مابین یہ گفتگو ہوئی:

اَفَلَمْ تَكُنْ تُخْبِرُنَا اَنَّا سَنَأْتِي الْبَيْتَ وَنَطُوْفُ بِهٖ قَالَ بَلٰى اَفَاَخْبَرْتُكَ اَنَّكَ تَأْتِيهِ عَامَكَ هٰذَا قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاِنَّكَ اٰتِيهِ وَتَطُوْفُ بِهٖ.

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا آپ نے ہمیں یہ خبر نہیں دی تھی کہ ہم بیت اللہ جائیں گے اور طواف کریں گے؟ آپ نے جواب دیا ہاں! لیکن کیا میں نے کہا تھا کہ تم اسی سال جاؤ گے، میں اب بھی کہتا ہوں کہ بیت اللہ جاؤ گے اور طواف کرو گے۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی:۔

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَاتَخَافُوْنَ فَعَلِمَ مَالَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا. (الفتح: ایت ۲۷)

''اللہ تعالیٰ نے یقیناً اپنے رسول علیہ السلام کو سچا خواب دکھایا تھا، تم

ضرور مسجدِ حرام میں داخل ہو گے، امن کے ساتھ سر منڈاتے ہوئے اور بال ترشواتے ہوئے بغیر اس کے کہ تمہیں کسی قسم کا خوف ہو، اللہ کو اس بات کا علم تھا جسے تم نہیں جانتے تھے، اس لئے اس نے اس سے پہلے یہ قریب کی فتح (صلح حدیبیہ) عطا فرمائی"۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خواب کے ذریعے مکہ میں داخل ہونے کا یہ بتایا گیا تھا کہ آپ اپنے ساتھیوں کو لے کر مکہ کو جائیں، کفار روکیں گے، آخر کار صلح ہو گی جس کے ذریعے دوسرے سال عمرے کا موقع ملے گا اور آئندہ کے لئے فتوحات کا دروازہ کھلے گا۔ یہ بھی قرآن کے علاوہ وحیِ خفی سے ہدایات ملنے کا کھلا ثبوت ہے چنانچہ اہل حق کا مسلک یہ ہے کہ انبیاءِ کرام کے رؤیا وحی ہوتے ہیں۔

(۵) سورۂ نجم میں معراج کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰی. (النجم، ایت)

"اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کی طرف وحی کی، جو بھی وحی کی"۔

اس وحی کی کنہ اور حقیقت تو اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں، بہر حال صحیح مسلم کی حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ اس میں اُمت کے لئے یہ بشارت بھی دی گئی ہے کہ ان کے بڑے بڑے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔[1]

---

[1] صحیح مسلم، ج ۱: ۹۷۔

اسی طرح یہ بھی ثابت ہے کہ اس وحی میں ابتداً پچاس نمازیں بھی فرض کی گئی تھیں چنانچہ مشہور مفسر علامہ ابن جریر طبری حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍ اَنَّهٗ عَرَجَ جِبْرِیْلُ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اِلَی السَّمَاءِ السَّابِعَةِ ثُمَّ عَلَا بِهٖ بِمَا لَا یَعْلَمُهٗ اِلَّا اللّٰهُ حَتّٰی جَاءَ سِدْرَةَ الْمُنْتَهٰی وَدَنَا الْجَبَّارُ رَبُّ الْعِزَّةِ حَتّٰی کَانَ مِنْهُ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی فَاَوْحَی اللّٰهُ اِلَیْهِ فِیْمَا اَوْحٰی خَمْسِیْنَ صَلٰوةً عَلٰی اُمَّتِهٖ کُلَّ یَوْمٍ وَّلَیْلَةٍ[1]

”حضرت جبریل علیہ السلام رسول اکرم ﷺ کو ساتویں آسمان تک لے گئے پھر آپ اس بلندی کی طرف گئے جس کی حقیقت خدا ہی جانتا ہے یہاں تک کہ سدرۃ المنتہیٰ آیا، رب العزۃ حضور علیہ السلام سے قریب ہوا اور مزید قریب ہوا یہاں تک کہ قاب قوسین سے بھی زیادہ قریب ہوئے پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو وحی فرمائی جو بھی وحی فرمائی اس میں ابتداً اُمت پر پچاس نمازیں فرض کی گئیں“۔

اس کے بعد حضور علیہ السلام کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مشورے سے تخفیف کے لئے عرض کرنا یہاں تک کہ صرف پانچ نمازیں رہ گئیں، یہ سب

---

[1] تفسیر ابن جریر، ج ۲۷: ص ۲۴۔

کچھ وحیِ خفی سے ثابت ہوا، قرآنِ مجید میں اس واقعہ کا ذکر نہیں۔

(٦) سورۂ تحریم میں ہے کہ حضور ﷺ نے اپنی ایک زوجہ محترمہ سے راز کی بات کہی انہوں نے دوسری کے سامنے اس کا ذکر کیا اور کچھ حصہ سے اعراض کیا، اس زوجہ مطہرہ نے جب آپ سے سوال کیا مَنْ اَنْبَاکَ هٰذَا؟ (آپ کو یہ کس نے بتایا؟) تو آپ نے فرمایا نَبَّأَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ. (مجھے علیم وخبیر خدا نے خبر دی ہے)۔

اس سے بھی ہمارا مدعا ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وحیِ خفی کے ذریعے حضور ﷺ کو آگاہ کر دیا کہ آپ کی اہلیہ نے دوسری اہلیہ کے سامنے اس بات کا ذکر کیا ہے۔

یہاں پر یہ کہنا کہ علیم وخبیر سے مراد ایسا آدمی ہے جو اس راز سے آگاہ تھا سراسر غلط ہے اس لئے کہ "اَلْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ" کا اطلاق قرآن مجید میں غیر خدا پر کہیں نہیں کیا گیا، دوسرا یہ کہ اَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَیْهِ کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بطورِ خاص وحی کے ذریعے آپ کو اس راز سے آگاہ کر دیا تھا۔

یہاں سے یہ بھی ثابت ہوا کہ قرآن کے علاوہ بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر وحی آتی تھی۔

(٧) حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہود

بنی نضیر کی مسلسل بد عہدیوں سے تنگ آکر ۴ھ میں ان کی بستیوں پر چڑھائی کی، دورانِ محاصرہ اسلامی فوج نے آپ کے حکم سے ان کے کچھ باغات وغیرہ کاٹ دیئے تاکہ حملہ کرنے کے لئے راستہ صاف ہو۔ اس پر مخالفین نے شور مچایا کہ مسلمان دعویٰ تو اصلاح کا کرتے ہیں لیکن باغوں کو اجاڑ کر اپنے عمل سے مفسد ہونے کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔[1]

اس کے جواب میں رب تعالیٰ نے سورۂ حشر میں ارشاد فرمایا:

مَاقَطَعْتُمْ مِنْ لِّيْنَةٍ اَوْتَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ.

"کھجوروں کے جو درخت تم نے کاٹے اور جو رہنے دیئے یہ دونوں کام اللہ تعالیٰ کی اجازت سے تھے"۔

کیا یہ اجازت قرآنِ مجید کی کسی آیت میں موجود ہے؟ ہرگز نہیں تو لازمی طور پر ماننا پڑے گا کہ وحیِ خفی کے ذریعے یہ اجازت دے دی گئی۔

اس مقام پر اعترافِ حقیقت سے بچنے کے لئے لوگ یہ کہتے ہیں کہ اذنِ الٰہی سے مراد یہ ہے کہ جب جنگ کی اجازت قرآنِ مجید میں نازل ہوئی تو اس کے ساتھ رائج الوقت قواعدِ جنگ کی اجازت بھی سمجھی جاسکتی ہے نیز یہ کہ اذنِ الٰہی سے مراد قوانین فطرت ہیں گویا قانونِ فطرت کی رو سے ایسا کیا گیا نہ یہ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو وحی کے ذریعے اس امر سے آگاہ کیا گیا

---

[1] البدایۃ والنہایۃ، ج ۴: ص ۷۴، ۷۵۔

لیکن ہر ذی ہوش آدمی سمجھ سکتا ہے کہ مخالفین (یہود وغیرہ) کے شور مچانے کے جواب میں رائج الوقت قوانین جنگ کا سہارا کیونکر لیا جا سکتا ہے جنہیں مسلمان بھی فساد فی الارض اور ظلم و بربریت کا مترادف سمجھتے تھے۔

رہے قوانین فطرت تو یہاں ان کا حوالہ بھی موزوں نہیں اس لئے کہ جب مخالفین نے مسلمانوں پر فساد کا الزام لگایا اور ان کے اس اقدام کو حکم الٰہی کے خلاف قرار دیا تو جواب میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہاں قوانین فطرت مراد ہیں اور پھر باذن اللہ سے قوانین فطرت مراد لینا کس لغت کی رو سے درست ہے؟

غرضیکہ اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس معاملے میں (اور اسی طرح دیگر بہت سے معاملات میں، جن کی تفصیل باعث تطویل ہے) وحی کے ذریعے اپنے پیغمبر ﷺ کی راہنمائی فرمائی یہ وحی اگرچہ بصورتِ قرآن وحیِ جلی نہ بھی ہو مگر ایک حقیقت ثابتہ ضرور ہے اور اس وحی کا اقرار ایمان بالرسالۃ کا ایک جز ہے۔ یہ وحی ہمیں سنت کی شکل میں ملتی ہے اور یہ بھی حجتِ شرعیہ ہے یہ سنت عارضی اور وقتی نہیں بلکہ دائمی اور ابدی ہے کیونکہ جس طرح قرآنِ مجید تمام عالم کے لئے سامانِ ہدایت ہے یونہی رسولِ اکرم ﷺ تمام عالم کے لئے بشیر و نذیر ہیں جب نبی کی نبوت ابدی ہے تو ماننا پڑے گا کہ اس کی تعلیم بھی ابدی ہے اور اس کی سنت بھی تاقیامت سب لوگوں کیلئے

مشعلِ ہدایت ہے جس کی روشنی میں ہر بھٹکا ہوا راہی اپنی کھوئی ہوئی راہ پا سکتا ہے اور منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔

وحی کا عام مفہوم

وہ تمام آیات جن میں اتباعِ وحی کا ذکر کیا گیا ہے مثلاً قُلْ اِنَّمَا اَتَّبِعُ مَا یُوْحٰی اِلَیَّ مِنْ رَّبِّیْ. (فرما دیجئے میں تو اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو رب تعالیٰ کی طرف سے وحی کی جاتی ہے) نیز قُلْ اِنَّمَا اُنْذِرُکُمْ بِالْوَحْیِ (فرما دیجئے میں تمہیں وحیِ الٰہی کے ذریعے ڈراتا ہوں) وغیرہ۔

ان آیات میں وحی کا عام مفہوم مراد ہے چاہے کتابِ متلو کی صورت میں ہو یا بصورتِ سنتِ مرویہ، قرآنِ مجید نے رسولِ اکرم ﷺ کے متعلق واضح طور پر فرما دیا وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (آپ اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں فرماتے آپ کی ہر بات خدا کی طرف سے وحی ہوتی ہے)۔

اگرچہ اس مقام پر بعض اہلِ علم حضرات نے اسے قرآن کے ساتھ خاص کیا ہے لیکن ''مَا یَنْطِقُ'' میں جو مفہوم نطق پایا جاتا ہے وہ تخصیص کی بجائے تعمیم کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ مشہور مفسر و مفکر امام فخر الدین رازی یہاں دونوں توجیہیں نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اَلْوَجْہُ الثَّانِیْ اَنَّہٗ عَائِدٌ اِلٰی مَذْکُوْرٍ ضِمْنًا وَھُوَ قَوْلُ

النَّبِيِّ ﷺ وَكَلَامُهُ وَذٰلِكَ لِاَنَّ قَوْلَهُ تَعَالٰى وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى فِيْ ضِمْنِهِ النُّطْقُ وَهُوَ كَلَامٌ فَكَاَنَّهُ تَعَالٰى يَقُوْلُ وَمَا كَلَامُهُ وَهُوَ نُطْقُهُ اِلَّا وَحْيٌ۔[1]

آیت میں دوسری توجیہ یہ ہے کہ یہ ضمیر (هُوَ) قول نبی اور کلام نبی کی طرف راجع ہے جس کا ضمناً ذکر آچکا ہے اس لئے کہ "مَا يَنْطِقُ" کے ضمن میں نطق کا مصدری مفہوم موجود ہے اور نطق کلام وقول کو کہتے ہیں پس گویا اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کلام اور نطق وحیِ الٰہی ہیں۔

عصر حاضر کے عظیم مفسر علامہ شہاب الدین محمود آلوسی بغدادی (م ۱۲۷۵ھ) بھی یہی مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قِيْلَ الْمُرَادُ مَايَصْدُرُ نُطْقُهُ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ مُطْلَقًا عَنْ هَوًى وَهُوَ عَائِدٌ لِمَايَنْطِقُ بِهٖ مُطْلَقًا اَيْضاً.[2]

کہا گیا ہے اس سے رسولِ اکرم ﷺ کا مطلقاً نطق بھی مراد ہوسکتا ہے اس طرح ضمیر مطلقاً "مَا يَنْطِقُ" کی طرف راجع ہوگی۔ اور مفہوم یہ ہوگا کہ رسولِ پاک ﷺ کا ہر کلام ہوائے نفس سے پاک ہے اور وحیِ الٰہی سے ہے۔

حفاظت حدیث پر ایک واضح استدلال

جب یہ ثابت ہوگیا کہ حدیث بھی وحیِ الٰہی ہے اور یہ قرآن کا بیان

---

[1] تفسیر مفاتیح الغیب (تفسیر کبیر) ج ۷: ص ۷۰۰۔ [2] تفسیر روح المعانی پ ۲۷: ص ۴۶۔

ہے اللہ تعالیٰ نے جس طرح جمعِ قرآن کو اپنے ذمہ کرم میں لیا ہے اسی طرح بیانِ قرآن کو بھی جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ سورۃ القیامہ میں ارشاد خداوندی ہے اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ۔ اس میں واضح طور پر جمعِ قرآن کی ذمہ داری کا ذکر ہے، پھر فرمایا ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ، یہاں بیان وتشریحِ قرآن کو بھی اپنے ذمہ لے لیا لہٰذا یہ ماننا پڑے گا کہ جس طرح الفاظِ قرآن محفوظ ہیں اسی طرح قرآن کا بیان بھی کیونکہ قرآن نظم ومعنٰی دونوں کا نام ہے جیسا کہ علمائے اصول نے تصریح کی ہے چنانچہ فخر الاسلام علی بن محمد بزدوی (م ۴۸۲ھ) فرماتے ہیں:

وَهُوَ النَّظْمُ وَالْمَعْنٰى جَمِيْعًا فِيْ قَوْلِ عَامَّةِ الْعُلَمَاءِ وَهُوَ الصَّحِيْحُ مِنْ قَوْلِ اَبِيْ حَنِيْفَةَ[1]

"قرآن نظم ومعنٰی دونوں کا نام ہے جمہور علماء کا یہی قول ہے اور امام ابوحنیفہ کا قول بھی یہی ہے"۔

غرضیکہ جب قرآن نظم ومعنٰی دونوں کا نام ہے لہٰذا اگر صرف نظم قرآن کو محفوظ مانا جائے اور معنٰی کی حفاظت کا قول نہ کیا جائے تو یہ حفاظت ناقص ٹھہرے گی حالانکہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ۔

---

[1] کنز الوصول الی معرفۃ الاصول (اصول بزدوی) ص ۵۔

"بے شک ہم نے اتارا ہے یہ قرآن اور بے شک ہم اس کے نگہبان ہیں"۔

یہاں مطلق حفاظت کا وعدہ ہے الفاظ کے ساتھ یہ وعدہ مخصوص نہیں لہٰذا حفاظت کاملہ جامعہ مراد ہوگی جو لفظ و معنٰی دونوں پر مشتمل ہوگی پھر یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ اس کہ حفاظت کو زمان و مکان کی قید سے آزاد رکھا، گویا اشارہ کر دیا کہ ہمیشہ کے لئے الذکر یعنی قرآنِ مجید محفوظ ہے اور اسی طرح اس کا بیان بھی محفوظ ہے پھر جس طرح قرآنِ مجید کی حفاظت کے لئے حفاظ ِ قرآن کے سینوں کو منتخب کیا گیا اسی طرح حفاظتِ حدیث کے لئے حفاظ ِ حدیث اور محدثین عظام کا انتخاب ہوا قرآن کی حفاظت تدریجاً ہوئی پہلے اسے حفظ کیا گیا اور مختلف چیزوں پر اسے لکھا گیا بعد میں مختلف صحیفوں میں جمع ہوا اور پھر ایک مصحف مرتب و مدون ہوا اسی طرح حدیث پر بھی مختلف دور آئے ابتداً حفظ حدیث کا دور آیا جو دورِ صحابہ ہے اس وقت حدیث زیادہ تر سینوں کی امانت رہی، گو اس زمانہ میں کتابتِ حدیث کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا لیکن غلبہ حفظ کا تھا پھر تدوین حدیث کا دور آیا جو تابعین سے شروع ہوا پھر تجریدِ حدیث کا دور آیا جس میں مرفوع اور غیر مرفوع کو چھانٹا گیا آثارِ صحابہ و تابعین کو احادیثِ نبویہ سے الگ کیا گیا پھر تنقیدِ حدیث کا دور آیا جب کہ وضاعین حدیث کے فتنہ کو ختم کرنے کے لئے اربابِ صحاح ستہ و دیگر

محدثین نے جہاد کیا اور احادیث کو نکھار نکھار کر صحیح کو ضعیف سے الگ کر دکھایا اور اسناد پر زور دیا جانے لگا تاکہ اسناد کی روشنی میں صحت وعدم صحت کا فیصلہ کیا جاسکے اسی بنا پر حدیث کی مختلف اقسام بیان کی گئیں اور قرآنی اصولوں کی روشنی میں ان کے مختلف احکام مرتب کئے گئے اس طرح حدیث وسنت کے لئے سینکڑوں علوم معرض وجود میں آئے۔

قرآن وحدیث کی حفاظت میں ایک فرق

اُمتِ مسلمہ نے متن قرآن کی بھی حفاظت کی اور اس کے شرح وبیان کو بھی محفوظ رکھا البتہ اتنا فرق ضرور ہے کہ کلامِ الٰہی کی وحی چونکہ بلفظہٖ نازل ہوئی تھی اس لئے وہاں الفاظ کا بعینہٖ محفوظ رکھنا لازمی تھا کیونکہ وحی کلام کی تھی اور وہی کلام معجزہ تھی مگر اس وحیِ غیر متلو (سنت) میں معانی ومطالب تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے القاء کئے گئے مگر الفاظ خدا کی طرف سے نازل شدہ نہ تھے اسلئے یہاں تحفظ الفاظ بعینہٖ اتنا ضروری نہ تھا بلکہ روایت بالمعنیٰ کی بھی اجازت تھی اس لئے اُمت نے نفس مضمونِ وحی کی حفاظت پر زیادہ زور دیا اگرچہ اس کے ساتھ ساتھ الفاظ کو بھی محفوظ رکھنے کی بھرپور کوشش کی چنانچہ نتیجہ کے طور پر صحیح احادیث کے الفاظ یا تو بعینہٖ محفوظ ہیں یا ایسے متقارب ہیں کہ اصل عبارت کے قریب قریب ہیں بہرحال حدیث کی غیر معمولی حفاظت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوئی کیونکہ مشیتِ الٰہی کو یہی منظور تھا کہ اس کی

مقدس کتاب کی تشریح بھی سنت اور وحی کے ذریعے ہو اور اس بارے میں عقل انسانی کو مطلق العنانی حاصل نہ ہو ورنہ ہر انسان کی عقل اسے کسی اور طرف راہ دکھائے گی اور اس طرح کتاب اللہ سے جو وحدتِ فکری مقصود ہے معدوم ہو جائے گی۔

کیونکہ حدیث معانی و مطالبِ قرآنی کی توضیح کر کے وحدتِ فکری کا سبب بنتی ہے اور اصولی نزاع پیدا نہیں ہونے دیتی۔

حدیث اور افتراق امت

لیکن افسوس ہے کہ اس کے برعکس بعض حضرات پیغمبر اسلام ﷺ کی احادیثِ طیبہ کو افتراق و انتشار کا موجب قرار دیتے ہیں ان کا خیال ہے کہ اگر احادیث کو درمیان سے ہٹا دیا جائے تو اتفاق ہے ورنہ نہیں۔

ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ اگر سنتِ رسول علیہ السلام کو درمیان سے ہٹا دیا جائے اور ہر شخص کو یہ حق دیا جائے کہ وہ اپنی سمجھ اور دانش کے مطابق جس طرح چاہے قرآن کی تشریح و تفسیر کرے تو کیا اس سے انتشار نہ پھیلے گا؟ بنظر انصاف دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ افتراق و انتشار کا باعث نہ تو قرآن ہے اور نہ حدیث بلکہ وہ عقل نارسا اور فکر ناہموار ہے جو صرف اپنے اعتماد پر مذہب کا نقشہ تیار کرنا چاہتی ہے چونکہ ہر فرد کی رائے کا انداز دوسرے سے مختلف ہے اس لئے ہر فرد بشر کو تشریح قرآن کا اختیار دینے سے

اختلافات کا دائرہ یقیناً زیادہ وسیع ہوگا۔

مثال کے طور پر دیکھئے قرآن نے اقامۃ الصلوٰۃ کا حکم دیا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کی تشریح وتوضیح کر دی اب جہاں تک نمازوں کے تعین اس کے اہم ارکان اور اجزاء کا تعلق ہے اُمت میں چنداں اختلاف نہیں لیکن اگر یہ کام عقل انسانی کے سپرد ہوتا تو خدا جانے اختلاف کس قدر رونما ہوتا ہر شخص مختلف تعبیر وتشریح کرتا اور ہر ایک کی راہ جدا ہوتی، حقیقت تو یہ ہے کہ احادیث نے اختلافات کے دائرہ کو محدود کر دیا چنانچہ بنیادی اصولوں میں تو اختلاف بہت کم ہے اور فروعی اختلاف اس قدر مضر نہیں بشرطیکہ عصبیت اور تنگ نظری سے کام نہ لیا جائے اور ایک فقہی مکتبِ فکر کا پیرو کار دوسرے پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش نہ کرے۔

غرضیکہ اختلافات کو ختم کرنے کے لئے احادیث کو مٹانے کی ضرورت نہیں بلکہ دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ تعصب اور تنگ نظری کو ختم کیا جائے اور اپنی عقل کی بجائے قرآن وسنت کو رہبر بنایا جائے۔

عقل قرباں کن بہ پیش مصطفیٰ
حسبی اللہ گو کہ اللہ ہم کفٰی

پہلی امتوں میں افتراق اس وقت پھیلا جب انہوں نے اپنے انبیاء کرام کے آثار وسنن کو چھوڑ کر اپنی رائے کی اتباع شروع

کردی[1]۔ امت محمدیہ میں بھی افتراق وانتشار خروج واعتزال کی تحریک سے پھیلا جو سنت وحدیث کی بجائے اپنی عقل نارسا کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو ثابت ہوگا کہ سنت نے اُمت میں افتراق وانتشار کو روکنے میں اہم کردار ادا کیا ہے سب سے پہلے جب رسولِ اکرم ﷺ کے وصال کے بعد اس امر میں اختلاف ہوا کہ آپ کو کہاں دفن کیا جائے تو اس وقت اس حدیث سے اختلاف ختم ہوا جو حضرت صدیق اکبر ؓ نے اس سلسلہ میں سب کے سامنے پیش کی تھی کہ مَا دُفِنَ نَبِیٌّ اِلَّا حَیْثُ قُبِضَ[2] (نبی وہیں دفن ہوتا ہے جہاں اس کی روح قبض کی جاتی ہے)۔

اسی طرح جب خلافت کے مسئلہ پر مہاجرین وانصار میں شدید اختلاف رونما ہوا اور انصار کہنے لگے مِنَّا اَمِیْرٌ وَّمِنْکُمْ اَمِیْرٌ (ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک تم سے ہو) اس وقت قریب تھا کہ ملتِ اسلامیہ میں سخت پھوٹ پڑ جاتی اور اسکا شیرازہ بکھر جاتا یہ سنت رسول ﷺ تھی جس نے اختلاف کو ختم کیا چنانچہ حضرت صدیق اکبر ؓ نے سب کے سامنے یہ حدیث پیش کی اَلْاَئِمَّۃُ مِنْ قُرَیْشٍ[3] (ملکی سربراہ خاندانِ قریش سے ہوں گے)۔ اس پر تمام صحابہ خاموش ہو گئے اور سنتِ رسول نے اس عظیم نزاع سے بچا لیا جو پہلے مرحلے پر ہی امت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیتا اب

---

[1] اعلام الموقعین، ۱: ص ۸۷، [2] الکامل لابن اثیر ج ۲: ص ۲۲۵، [3] تاریخ محاضرات اسلامی، ۱: ص ۱۲۸،

بھی امت کو انتشار وافتراق سے بچانے کا واحد ذریعہ سنتِ رسول علی الصلوٰۃ والسلام ہی ہے کیونکہ آخر امت کی اصلاح کا ذریعہ بھی وہی ہو سکتا ہے جو اوّلِ امت کی اصلاح کا ذریعہ تھا۔

ہم نے گزشتہ صفحات میں قرآن کی روشنی میں اتباعِ رسول علیہ السلام کی اہمیت رسولِ اکرم ﷺ کے قول وفعل کی شرعی حیثیت اور آپ کی سنت کی ضرورت واہمیت پر اپنی بساط کے مطابق کلام کیا ہے اب ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ خود اقوالِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ثابت کیا جائے کہ سنت کا مقام کیا ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سنت کی حفاظت کے لئے کس قدر تاکید فرمائی ہے۔

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ بحث کا یہ انداز منطقی نہیں کیونکہ دلیل ایسی ہونی چاہیے جس کے مقدمات فریقین کے نزدیک مسلم ہوں اور جب احادیث منکرین کے نزدیک حجت ہی نہیں تو انہیں منکرین کے سامنے بطور دلیل پیش کرنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے؟

اسکا جواب یہ ہے کہ جہاں تک احادیث کی حجیت اور اتباعِ سنت کی اہمیت کا تعلق ہے ہم اسے آیاتِ قرآن سے ثابت کر چکے ہیں یہاں احادیث کے ذکر کا مقصد صرف اس شبہ کا ازالہ کرنا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے اپنی امت کو قرآن کے بغیر اور کچھ نہیں دیا اور اسے محفوظ رکھنے کی

کوئی ہدایت نہیں فرمائی اگر شریعت میں اس کا کوئی مقام ہوتا تو حضورﷺ ضرور ایسا کرتے۔

اب ہم انشاء اللہ ان کے اس شبہ کا ازالہ احادیثِ صحیحہ سے کریں گے اور صاحبِ سنت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اقوال کی روشنی میں سنت کی اہمیت کو واضح کریں گے۔

مقام سنت صاحب سنت ﷺ کی نظر میں

رسولِ اکرم ﷺ نے بارہا اپنی سنت کی اہمیت کو واضح فرمایا اور اپنی اطاعت کو انتہائی لازمی قرار دیا چنانچہ اس سلسلے میں حسبِ ذیل ارشادات خصوصی طور پر قابل غور ہیں۔

۱۔ صحیح بخاری میں ہے:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ اُمَّتِیْ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ اَبٰی قِیْلَ وَمَنْ یَّاْبٰی قَالَ مَنْ اَطَاعَنِیْ دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ اَبٰی۔[1]

"میری ساری امت بہشت میں جائے گی سوائے اس کے جس نے انکار کیا عرض کی گئی وہاں جانے سے کون انکار سکتا ہے؟ فرمایا جس نے میری اطاعت کی بہشت میں داخل ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی وہ

---

[1] صحیح بخاری (مصری) کتاب الاعتصام، ۹: ص ۱۱۴۔

انکاری بنا''۔ (اور جہنم کا مستحق بنا)

کچھ لوگ کہتے ہیں اطاعت صرف زندہ کی ہوتی ہے حضور ﷺ کی اطاعت بھی آپ کی حیات طیبہ تک تھی، یہ بالکل غلط اور دور از حقیقت بات ہے جس طرح ایمان بالرسالۃ ظاہری حیات طیبہ کیساتھ خاص نہیں بلکہ قیامت تک کے لئے عام ہے اسی طرح اطاعت بھی قیامت تک کے لئے عام ہے نیز رسولِ اکرم ﷺ کا حیاتِ طیبہ حقیقیہ کے ساتھ زندہ ہونا ایک حقیقتِ واقعیہ ہے جس پر احادیثِ کثیرہ دال ہیں[۱] اہل حق کا اس پر اتفاق ہے لہٰذا آپ کی اطاعت سے کسی دور میں بھی انکار کرنا وہی انکار ہے جو جنت سے محرومی کا باعث ہے۔

۲- رسولِ خدا ﷺ کی اتباع کی اہمیت اس سے واضح ہو جاتی ہے کہ آپ کی پیروی کے بغیر کمالِ ایمانی حاصل نہیں ہو سکتا چنانچہ مشکوٰۃ شریف میں شرح السنۃ کے حوالے سے یہ حدیث منقول ہے:

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعاً لِمَا جِئْتُ بِهٖ.[۲]

''تم میں سے کوئی آدمی صاحبِ ایمان نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ اپنی خواہش کو میری لائی ہوئی تعلیمات کے تابع نہ کر دے''۔

---

[۱] الحاوی للفتاوی (للسیوطی)، ج ۲: ص ۱۴۷

[۲] مشکوٰۃ المصابیح، ص ۳۰۔

ظاہر ہے کہ اس میں کتاب وسنت دونوں کی پیروی شامل ہے، دونوں چیزیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عطا کی گئی ہیں اور دونوں کی اطاعت لازمی ہے۔

۳۔سنت کی اطاعت کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ امورِ عزیمت کے علاوہ امورِ رخصت میں بھی آپ کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے کہ ایک دفعہ حضور ﷺ نے بعض امور کے بارے میں رخصت دی لیکن کچھ حضرات نے یہ کہہ کر کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا معاملہ ہم سب سے مختلف ہے، اس رخصت سے احتراز کیا اس پر آپ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

مَابَالُ اَقْوَامٍ يَتَنَزَّهُوْنَ عَنِ الشَّيْئِ الَّذِیْ اَصْنَعُهٗ فَوَاللّٰهِ اِنِّیْ لَاَعْلَمُهُمْ بِاللّٰهِ وَاَشَدُّهُمْ خَشْيَةً لَهٗ. [1]

"ان لوگوں کا کیا حال ہے جو میری عمل میں لائی ہوئی رخصت سے گریز کرتے ہیں خدا کی قسم! مجھے ان سے خدا کی معرفت زیادہ حاصل ہے اور میرے دل میں ان سے زیاہ خدا کا خوف ہے"۔

یعنی رخصت سے گریز کا باعث عموماً جذبہ تقویٰ اور خوفِ خدا ہوا کرتا ہے اور یہ چیزیں میری ذات میں بدرجہءِ اتم موجود ہیں لہٰذا میری سنت

---

[1] صحیح بخاری (مصری) ۹: ص۱۲۰۔

سے ثابت شدہ رخصت سے پرہیز کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ اگر رخصت سے گریز پر اتنا عتاب ہو رہا ہے تو مطلقاً سنت کی حجیت سے انکار پر کس قدر سرکارِ دو عالم ﷺ ناراض ہوں گے؟

۴- سنت کی اہمیت اس سے بھی واضح ہو جاتی ہے کہ آپ نے کتاب اللہ کے ساتھ اس کا ذکر ملا کر فرمایا اور اسے سب سے اعلیٰ و افضل سیرت قرار دیا صحیح مسلم و دیگر کتب حدیث میں سند صحیح کیساتھ یہ حدیث روایت کی گئی ہے:

عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ خَيْرَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللّٰهِ وَخَيْرَ الْهُدٰى هُدٰى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَشَرُّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ۔[1]

---

[1] صحیح مسلم، ج۱: ص۲۸۴۔ (فائدہ) کچھ حضرات اس حدیث کو دلیل بنا کر ہر نئی بات کو بدعت کہنا شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح اہلسنت کے بہت سے معمولات کو بدعت میں شمار کر کے ضلالت و گمراہی کا سبب قرار دیتے ہیں۔ ان کی خدمت میں مخلصانہ عرض ہے کہ وہ بدعت کے فتویٰ جاری کرنے سے پہلے شارحینِ حدیث کے کلام کا بھی مطالعہ فرما لیتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ امام محی الدین نووی شارح مسلم (جن کی شرح انتہائی متداول اور مقبول ہے) اس حدیث کے ذیل میں لکھتے ہیں: هذا عام مخصوص والمراد غالب البدع قال اهل اللغة هی کل شیء علی غیر مثال سبق قال العلماء البدعة خمسة اقسام واجبة و مندوبة ومحرمة ومکروهة ومباحة. ”یہ حدیث مخصوص البعض ہے، اس سے مراد بدعات کا غالب حصہ ہے۔ اہل لغت، ہر اس بات کو جس کی پہلے سے مثال نہ ملتی ہو، بدعت کہہ دیتے ہیں، علماء نے بدعت کی پانچ قسمیں بیان کی ہیں، واجب، مستحب، مکروہ، حرام اور مباح“۔ (بقیہ اگلے صفحے پر)

’’حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے حمد وثنا کے بعد فرمایا یاد رکھو سب سے بہتر کلام اللہ کا کلام ہے اور سب سے بہتر سیرت محمد ﷺ کی سیرت ہے بری باتیں وہ ہیں جو دین میں اپنی طرف سے گھڑی جائیں ہر بدعت گمراہی ہے‘‘۔

اس سے ثابت ہوا کہ جیسے کتاب اللہ ہمیشہ کے لئے سامانِ ہدایت ہے اسی طرح رسولِ اکرم ﷺ کی سیرت بھی ہمیشہ کے لئے حجتِ شرعیہ ہے نیز یہ کہ اس سیرت وسنت کے منافی جو عقائد واعمال اختیار کئے جائیں وہ

پھر ان کی مثالیں بیان کی ہیں، بدعتِ واجبہ کی مثال میں علمائے متکلمین کے دلائل کی تدوین اور ملاحدہ وفرقِ باطلہ کا رد، بدعاتِ مندوبہ کی مثال میں کتبِ علوم کی تصنیف وتالیف، مدارس اور سراؤں کا قیام وغیرہ، بدعاتِ مباحہ میں رنگ برنگ کھانوں کا استعمال کرنا ذکر کیا ہے، بدعاتِ محرمہ اور مکروہ کو امام موصوف نے اور ظاہر وواضح قرار دیا ہے، آخر میں فرماتے ہیں: **وقد اوضحت المسئلة بادلتها المبسوطة فی تهذیب الاسماء واللغات فاذا عرف ما ذکرته علم ان الحدیث من العام المخصوص وکذا ماشبهه من الاحادیث الواردة ویؤده ما قلنا قول عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ عنه فی التراویح نعمت البدعة هٰذه ولا یمنع من کون الحدیث عاما مخصوصا قوله کل بدعة مؤکدا بکل یدخله التخصیص مع ذٰلک کقوله تدمر کل شیٔ** (شرح نووی ج ا: ص ۲۸۵ تحت حدیث مذکورہ) ’’میں نے اس مسئلہ کو دلائل مبسوطہ کے ساتھ تہذیب الاسماء واللغات میں واضح کردیا ہے، مذکورہ بحث کو سمجھ لینے کے بعد یہ معلوم ہوگیا کہ یہ حدیث عام مخصوص البعض ہے اور اسی طرح اس کے مشابہ جو حدیثیں بدعات کے بارے میں عام مخصوص البعض ہیں، ہمارے قول کی تائید کیلئے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد موجود ہے کہ تراویح کی جماعت کے اہتمام کے بارے میں انہوں نے فرمایا یہ اچھی بدعت ہے۔ یہاں لفظ ’’کل‘‘ کا بدعت پر داخل ہونا تخصیص کے منافی نہیں جیسا کہ آیہ قرآنیہ **تدمر کل شیٔ** میں لفظ کُلّ کے باوجود تخصیص پائی جاتی ہے۔ (مزید تفصیل کیلئے امام شاطبی کی الاعتصام ملاحظہ ہو، ا: ص ۱۴۷۔)

بدعت وضلالت ہیں۔

۵-رسول اللہ ﷺ نے کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کو گمراہی سے بچنے کا واحد ذریعہ اور ان سے اعتصام کو صحیح معیارِ ہدایت قرار دیا ہے آپ کا مشہور ارشاد ہے:

اِنِّیْ تَرَکْتُ فِیْکُمْ اَمْرَیْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّکْتُمْ بِهِمَا كِتَابُ اللّٰهِ وَسُنَّةُ رَسُوْلِهٖ. [۱]

''میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں جب تک ان کو مضبوطی سے تھامے رہو گے گمراہ نہیں ہو گے، ان میں ایک تو اللہ کی کتاب ہے اور دوسری میری سنت ہے''۔

امام مالک نے اس حدیث کو مرسلاً روایت کیا ہے مگر امام حاکم نے سند متصل کیساتھ حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے یہ حدیث طویل ہے اس میں یہ الفاظ ہمارے لئے محل استدلال ہیں:

اِنِّیْ قَدْ تَرَکْتُ فِیْکُمْ مَآ اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ فَلَنْ تَضِلُّوْا اَبَدًا كِتَابُ اللّٰهِ وَسُنَّةُ نَبِيِّهٖ. [۲]

امام حاکم نیشاپوری اس روایت کے تمام رواۃ کو متفق علیہ اور ثقہ قرار دیتے ہیں۔

علامہ شمس الدین ذہبی نے بھی تلخیص مستدرک میں حضرت ابوہریرہ

---

[۱] مؤطا امام مالک، باب النہی عن القول فی القدر، ص۷۰۲۔ [۲] مستدرک حاکم، ج۱: ۹۳۔

ؓ کی حدیث کو بطورِ شاہد پیش کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہِ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنِّیْ قَدْ تَرَکْتُ فِیْکُمْ شَیْئَیْنِ لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَھُمَا کِتَابَ اللّٰہِ وَسُنَّتِیْ وَلَنْ یَفْتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَی الْحَوْضِ۔[۱]

ان روایات سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ کتاب اللہ کی طرح سنتِ رسول اللہ بھی حجتِ شرعیہ ہے کتاب اللہ اور سنت رسول کا گہرا تعلق ہے کتاب اللہ و سنت ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتیں لہٰذا سنت کے بغیر قرآن پر عمل کا دعویٰ قابل قبول نہیں ہے۔

۶-رسول خدا ﷺ کو اپنی سنت کس قدر عزیز تھی اس کا اندازہ ترمذی کی اس حدیث سے لگایئے جو حضرت انس ؓ سے مروی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

یَابُنَیَّ اِنْ قَدَرْتَ اَنْ تُصْبِحَ وَتُمْسِیَ وَلَیْسَ فِیْ قَلْبِکَ غِشٌّ لِاَحَدٍ فَافْعَلْ ثُمَّ قَالَ یَابُنَیَّ وَذٰلِکَ مِنْ سُنَّتِیْ وَمَنْ اَحَبَّ سُنَّتِیْ فَقَدْ اَحَبَّنِیْ وَمَنْ اَحَبَّنِیْ کَانَ مَعِیْ فِی الْجَنَّۃِ۔[۲]

"اے بیٹے! اگر تم سے ہو سکے تو اس حال میں صبح و شام کرو کہ تمہارے دل میں کسی کے خلاف کھوٹ اور کینہ نہ ہو پھر فرمایا اے بیٹے! یہ میری سنت ہے اور جس نے میری سنت سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت

---

[۱] تلخیص المستدرک، ج ۱: ص ۹۳۔

[۲] جامع ترمذی، ج ۲: ص ۹۷۔

کی اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا"۔

اسی طرح امام بیہقی اور ابن عدی نے حضرتِ ابن عساکر کی ایک روایت ذکر کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

مَنْ تَمَسَّکَ بِسُنَّتِیْ عِنْدَ فَسَادِ اُمَّتِیْ فَلَہٗ اَجْرُ مِائَةِ شَہِیْدٍ.

"جس نے میری امت کے فساد کے دور میں میری سنت کو مضبوطی سے تھامے رکھا اسے سو شہید کے برابر اجر ملے گا"۔

صاحبِ مشکوٰۃ نے اسے باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ[1] میں ذکر کیا ہے لیکن بیان مخرج کی جگہ بیاض ہے۔

بیہقی اور ابن عدی کی مذکورہ بالا روایت میں حسین بن قتیبہ خزاعی مدائنی کا نام آیا ہے، اگرچہ ابن عدی نے اس کے بارے میں کہا ہے لَا بَأْسَ بِهٖ لیکن دار قطنی نے اسے متروک الحدیث، ابو حاتم نے ضعیف الحدیث اور ازدی نے واہی الحدیث کہا ہے، حافظ ابن حجر نے اسے لفظ ہالک سے یاد کیا ہے۔[2]

امام منذری کتاب الترغیب والترہیب میں فرماتے ہیں کہ اسے امام طبرانی نے حضرتِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایسی سند کے ساتھ روایت کیا ہے جس میں کوئی قابل گرفت راوی نہیں البتہ متن میں "مِـائَةُ شَہِیْدٍ" کی بجائے صرف "اَجْرُ شَہِیْدٍ" کا لفظ وارد ہے۔[3]

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح، ص ۲۷۔

[2] لسان المیزان (ابن حجر) ج ۲: ص ۲۳۶، ایضاً میزان الاعتدال (ذہبی) ج ۱: ۲۳۱۔

[3] الترغیب والترہیب، ج ۱: ص ۸۰۔

۷-رسولِ اکرم ﷺ کو اپنی سنت کی حفاظت انتہائی مرغوب تھی اس لئے آپ نے من گھڑت روایات بنانے والے گروہ سے دور رہنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

یَکُوْنُ فِیْ اٰخِرِ الزَّمَانِ دَجَّالُوْنَ کَذَّابُوْنَ یَأْتُوْنَکُمْ مِنَ الْاَحَادِیْثِ بِمَا لَمْ تَسْمَعُوْا اَنْتُمْ وَ لَا اٰبَاؤُکُمْ فَاِیَّاکُمْ وَاِیَّاهُمْ لَا یُضِلُّوْنَکُمْ وَلَا یَفْتِنُوْنَکُمْ۔[1]

”آخر زمانے میں دجال وکذاب قسم کے لوگ آئیں گے جو تمہارے پاس ایسی روایتیں لائیں گے جنہیں نہ تم نے سنا ہوگا اور نہ تمہارے بزرگوں نے تم ان سے دور رہنا اور انہیں اپنے آپ سے دور رکھنا کہیں وہ تمہیں گمراہ نہ کردیں اور فتنے میں نہ ڈال دیں“۔

رسولِ اکرم ﷺ کے ارشادات سے چونکہ شریعت کی عمارت تعمیر ہوتی ہے اس لئے آپ کی طرف کسی روایت کے منسوب کرنے میں شدید احتیاط کی ضرورت ہے چنانچہ رسولِ اکرم ﷺ کا ارشاد مَنْ کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ (جس نے میری طرف عمداً جھوٹی بات منسوب کی اس نے جہنم میں اپنا ٹھکانا بنایا) امام نووی نے بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ یہ حدیث تقریباً دو سو صحابہ سے مروی ہے یہ ایسی روایت ہے جسے عشرہ مبشرہ نے روایت کیا ہے۔[2]

---

[1] مقدمہ صحیح مسلم، ص ۱۰۔

[2] نووی شرح مقدمہ مسلم، ص ۸۔

۸۔ رسولِ اکرم ﷺ نے جہاں اپنی سنت کی اہمیت کو واضح کیا وہاں ایسے لوگوں سے بھی باخبر کیا جو سنت کا انکار کرنے والے تھے، رسولِ اکرم ﷺ نے اپنی پیغمبرانہ بصیرت اور وحیِ الٰہی سے ایسے لوگوں کے بارے میں پہلے سے پیشگوئی فرما دی جو حجیتِ حدیث کا انکار کریں گے اور اس مقصد کے لئے قرآن کو بطور ڈھال استعمال کریں گے اس بارے میں کثرت سے صحیح حدیثیں وارد ہیں، ہم ان میں سے صرف دو پر اکتفاء کرتے ہیں:

(۱) عَنْ اَبِیْ رَافِعٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ لَا اُلْفِیَنَّ اَحَدَکُمْ مُتَّکِئًا عَلٰی اَرِیْکَتِہٖ یَاْتِیْہِ الْاَمْرُ مِمَّا اَمَرْتُ بِہٖ اَوْ نَھَیْتُ عَنْہُ فَیَقُوْلُ لَا اَدْرِیْ مَا وَجَدْنَا فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ اتَّبَعْنَاہُ۔[1] (رواہ احمد والشافعی وابو داؤد والترمذی وابن ماجۃ واخرجہ الحاکم ایضاً)

”حضرت ابو رافع سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا میں تم میں سے کسی کو اپنی مسند پر ٹیک لگائے نہ پاؤں اس حال میں کہ اس کے پاس میرا امر یا کوئی نہی پہنچے تو وہ جواباً کہے ”میں اسے نہیں جانتا“ ہم جو کچھ قرآن میں پائیں گے اس کی پیروی کریں گے۔“

مذکورہ حدیث پر اعتراض کا جواب

موجودہ دور کے ایک ”روشن دماغ محقق“ (ڈاکٹر فضل الرحمٰن) نے

---

[1] مسند امام شافعی، ص ۲۰۔ ایضاً ابن ماجہ اوّل حدیث ۱۳۔ سنن ابی داؤد کتاب السنۃ، ج ۲: ص ۵۰۶۔

مذکورہ حدیث کو (جسے بڑے بڑے ائمہ حدیث نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے) بعد کے دور کی پیداوار قرار دیا ہے، ان کا استدلال یہ ہے کہ حدیث پیشین گوئی پر مشتمل ہے اور اس میں ایک قسم کا تعین پایا جاتا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ یہ اس دور میں وضع کی گئی ہے جب تحریکِ حدیث زوروں پر تھی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ صحابہ میں ایسا کوئی شخص نہیں تھا جو سنت کا من حیث المجموع انکار کرتا ہو لہٰذا اس قسم کی حدیث کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف صحیح نہیں۔

ہم نے ان کی تنقید کا خلاصہ بیان کیا ہے۔ آپ غور فرمائیں کہ کیا اسے علمی تنقید کہا جا سکتا ہے؟ محقق موصوف سند اور متن کے بارے میں کوئی علمی تنقید نہیں کر سکے، صرف اتنی سی بات کہ اس میں تعین کے ساتھ پیشینگوئی پائی جاتی ہے لہٰذا یہ حدیث مسترد ہے، کیا اس سے زیادہ دیدہ دلیری ہو سکتی ہے۔

ہمارے علماء و محدثین نے تنقیدِ روایت کے ایسے اصول مقرر کئے ہیں جنہیں مغربی مؤرخین بھی اعلیٰ درجہ کے اصول تسلیم کرتے ہیں، ان اصولوں کی روشنی میں کوئی بات کرنے کی بجائے محض ایک مفروضہ اور وہم پر ایک عمارت کھڑی کرنا کہاں کی دانشمندی ہے؟ یہ کہنا کہ چونکہ حضورِ اکرم ﷺ کے زمانے میں اس قسم کا کوئی گروہ نہیں تھا جو حدیث کا منکر ہو، اس لئے یہ حدیث بعد کی پیداوار ہے، سراسر غلط ہے، اس کا مفہوم تو یہ ہے کہ

پیغمبرِ اقدس ﷺ صرف اپنے سامنے کی تحریکوں اور فتنوں سے آگاہی رکھتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں آئندہ زمانے میں پیش آنے والے فتنوں سے آگاہ نہیں کیا تھا۔

غور فرمایئے صحیح احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ جن کا تعلق امورِ مستقبلہ اور آئندہ وقوع پذیر ہونے والے فتنوں سے ہے، اس اصول کی زد میں وہ سارا ذخیرہ موضوع قرار پاتا ہے۔ سوچنے کی بات ہے جب نبی اکرم ﷺ کی نبوت و رسالت قیامت تک کے لئے ہے تو کیا آپ کی پیغمبرانہ بصیرت اور خداداد فراست صرف اپنی حیاتِ ظاہرہ کے ساتھ مخصوص ہوگی؟ پھر یہ کہنا کہ عہدِ رسالت میں تو کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو سنت کا انکار کرتا ہو، اس بات کا واضح اعتراف ہے کہ صاحبِ موصوف کے نزدیک بھی یہ فتنہ (انکارِ حدیث) بعد کی پیداوار ہے ورنہ رسالت کے پاکیزہ عہد میں ایسا کوئی فرد بھی نہیں تھا جو حضور علیہ السلام کو رسول مانتا ہو لیکن آپ کی حدیث کو حجت نہ مانتا ہو۔

پیشینگوئیوں پر مشتمل احادیث کے بارے میں محدثین نے جو ضابطے مقرر کئے ہیں انہیں محققِ موصوف نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی، محدثین نے صرف ان روایات کے بارے میں ناقابلِ اعتماد ہونے کا قول کیا ہے جن میں پوری طرح تعینِ ماہ و سال کے ساتھ پیشینگوئی کی گئی ہو مثلاً یہ کہ جب فلاں سال اور فلاں ماہ آئے گا تو فلاں واقعہ ظہور پذیر ہوگا، چنانچہ

حضرت علامہ علی القاری الہروی، حافظ ابن قیم کے حوالے سے موضوع حدیث کی پہچان کے ضابطے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مِنْهَا اَحَادِيْثُ التَّوَارِيْخِ الْمُسْتَقْبِلَةِ وَقَدْ تَقَدَّمَتِ الْاِشَارَةُ اِلَيْهَا وَهُوَ كُلُّ حَدِيْثٍ فِيْهِ اِذَا كَانَتْ سَنَةُ كَذَا وَكَذَا حَلَّ كَذَا وَكَذَا [1]

”وہ حدیثیں بھی موضوعات میں شمار ہوں گی جن میں زمانہ مستقبل میں تاریخوں کے تعیین کے ساتھ خبریں دی گئی ہوں ان کی طرف پہلے بھی اشارہ ہو چکا ہے، یہ اس قسم کی حدیثیں ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ جب فلاں سن آئے گا فلاں واقعہ ظہور پذیر ہوگا۔“

مثال کے طور پر ایک روایتِ موضوعہ میں ہے جب سن ایک سو پینتیس آئیگا تو وہ شیاطین آزاد ہو جائیں گے جنہیں حضرت داؤد علیہ السلام کے فرزند حضرتِ سلیمان علیہ السلام نے سمندروں میں بند کر دیا تھا، استقراء اور تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے من گھڑت متن والی روایات کے راوی بھی کذاب و ناقابلِ اعتماد ہوتے ہیں، ہم نے حضرت ابو رافع سے جو حدیث روایت کی ہے اس میں ایسا کوئی راوی نہیں، بڑے بڑے ائمہ محدثین نے اس کی تخریج کی ہے پھر یہ کہ اس میں مہینے اور سال کے تعین کے بغیر ایک زبردست فتنہ سے آگاہ کیا گیا ہے اور ظاہر ہے یہ چیز منصبِ رسالت کیساتھ بالکل مناسبت رکھتی ہے اگر یہ چیز تشریع اسلامی کی روح کے منافی ہوتی تو

---

[1] الموضوعات الکبیر، ص ۱۴۸۔

اس قسم کی پیشینگوئیاں قرآن میں نہ پائی جاتیں حالانکہ قرآنِ مجید میں اس قسم کی کئی مثالیں پائی جاتی ہیں مثلاً رومیوں کے مغلوب ہونے کے بعد دوبارہ اہلِ فارس پر غالب آنے کی پیشینگوئی [۱] قرآنِ مجید کی کسی سورت کا مقابلہ نہ کر سکنے کی پیشینگوئی [۲] یاجوج ماجوج [۳] اور خروج دابۃ الارض کی پیشینگوئی [۴] مسلمانوں کو زمین پر اقتدار اور خلافتِ کاملہ [۵] ملنے کی پیشینگوئی وغیرہ، کیا معاذ اللہ یہ آیات بھی بعد کی پیداوار ہیں؟ آخر تنقید کا کوئی اصول مقرر کرتے وقت کچھ نہ کچھ حقائق کی دنیا سے بھی تعلق رکھنا چاہئے مذکورہ بالا حدیث کی تائید میں بکثرت روایات ہیں، ہم حضرتِ مقدام بن معدیکرب کی ایک روایت پیش کر رہے ہیں جسے ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے، ترمذی میں بھی الفاظ کے معمولی تغیر کے ساتھ یہ روایت موجود ہے۔

(ب) قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلَا اِنِّیْ اُوْتِیْتُ الْقُرْاٰنَ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ اَلَا یُوْشِکُ رَجُلٌ شَبْعَانٌ عَلٰی اَرِیْکَتِهٖ یَقُوْلُ عَلَیْکُمْ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ فَمَا وَجَدْتُّمْ فِیْهِ مِنْ حَلَالٍ فَاَحِلُّوْهُ وَمَا وَجَدْتُّمْ فِیْهِ مِنْ حَرَامٍ فَحَرِّمُوْهُ. [۶]

”رسولِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں خوب یاد رکھو مجھے قرآن بھی دیا گیا ہے اور (وحی اور حجتِ شرعیہ ہونے میں) اس کی مثل، قریب ہے کہ کوئی

---

[۱] سورۃ الروم، ایت ۱ تا ۴۔ [۲] سورہ بقرہ، ایت ۲۳۔ [۳] سورۃ الانبیاء ایت ۹۶۔ [۴] سورۃ النمل، ایت ۸۲۔

[۵] سورۃ النور، ایت ۵۵۔ [۶] ابوداؤد کتاب السنۃ ۲: ص ۵۹، ابن ماجہ حدیث ۱۲، ترمذی (مختصر) ۲: ص ۹۶۔

شکم سیر آدمی اپنی مسند پر ٹیک لگا کر یہ کہے کہ تم اسی قرآن کو لازم رکھو، اس میں جو حلال ہو اسے حلال سمجھو اور جو حرام ٹھہرایا گیا ہے اسے حرام جانو"

اس حدیث سے بھی منکرینِ سنت کی اس منطق سے آگاہ کر دیا کہ صرف قرآن کو لازم پکڑو اور اس کی تحلیل وتحریم پر اکتفاء کرو۔

رسولِ اکرم ﷺ نے "وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ" فرما کر اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا کہ سنت وحدیث بھی حجتِ شرعیہ اور وحیِ الٰہی ہونے میں قرآن کی مثل ہے، قرآن کی طرح سنت بھی حضور علیہ السلام کو خدا کی طرف سے عطا ہوئی ہے لہٰذا ایک کا اقرار اور دوسری کا انکار ظلمِ صریح نہیں تو اور کیا ہے؟

۹۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے سننِ مقدسہ اور احادیثِ طیبہ کو دوسروں تک پہنچانے اور انہیں یاد رکھنے کی تاکید فرمائی ہے، یہ تاکید بھی اس امر کی دلیل ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ اپنی سنت کو امت کے لئے حجتِ شرعیہ سمجھتے تھے چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ وفدِ عبدالقیس حضور علیہ السلام کی بارگاہ میں حاضر ہوا، آپ نے انہیں چار باتیں بجالانے اور چار باتیں چھوڑ دینے کی نصیحت فرمائی اور آخر میں فرمایا:

اِحْفَظُوْهُ وَاَخْبِرُوْهُ مَنْ وَرَائکُمْ.[1]

"انہیں یاد رکھو اور اپنے پچھلوں کو خبر دو۔"

اسی طرح حجۃ الوداع کے موقع پر انتہائی جامع اور بلیغ خطبہ دیتے

---

[1] صحیح بخاری کتاب العلم، ج ۱: ص ۲۲۔

ہوئے آخر میں ارشاد فرمایا:

اَلا لِیُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ فَلَعَلَّ بَعْضَ مَنْ یُّبَلِّغُهُ اَنْ یَّکُوْنَ اَوْعٰی لَهُ مِنْ بَعْضِ مَنْ سَمِعَهُ۔ [۲]

”حاضرین میری بات غائبین تک پہنچا دیں، ہوسکتا ہے بعض وہ آدمی جن تک میری بات پہنچائی جائے براہِ راست سننے والوں سے زیادہ یاد رکھنے والے ہوں۔“

رسولِ اکرم ﷺ نے اپنی سنت کی نشر و اشاعت کے لئے کس قدر بلیغ انداز میں تاکید فرمائی، اس کا اندازہ حسبِ ذیل حدیث سے ہوسکتا ہے جسے امام شافعی نے اپنی سندِ متصل کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت فرمایا ہے:

اِنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ نَضَّرَ اللّٰهُ عَبْدًا سَمِعَ مَقَالَتِیْ فَحَفِظَهَا وَوَعَاهَا وَاَدَّاهَا فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ غَیْرُ فَقِیْهٍ وَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ اِلٰی مَنْ هُوَ اَفْقَهُ مِنْهُ ثَلَاثٌ لَایَغُلُّ عَلَیْهِنَّ قَلْبُ مُسْلِمٍ اِخْلَاصُ الْعَمَلِ لِلّٰهِ وَالنَّصِیْحَةُ لِلْمُسْلِمِیْنَ وَلُزُوْمُ جَمَاعَتِهِمْ فَاِنَّ دَعْوَتَهُمْ تُحِیْطُ مِنْ وَّرَائِهِمْ۔ [۲]

”رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا خدا اس آدمی کو تر و تازہ رکھے جو میرے

---

[۱] صحیح بخاری، ج ۱: ص ۳۷۔

[۲] مسند امام شافعی، کتاب العلم ص ۱۶۔

الفاظ کو سنے، انہیں یاد کرے، اپنے دل میں محفوظ رکھے اور پھر دوسروں تک پہنچا دے، بہت سے لوگ جو دوسروں تک دین کی بات پہنچاتے ہیں، خود فقیہ نہیں ہوتے (اور بعض اوقات پہنچانے والے خود بھی فقیہ ہوتے ہیں) لیکن جن تک وہ پہنچاتے ہیں ان سے زیادہ دین کی سمجھ رکھتے ہیں، تین چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں مسلمان کو کبھی اپنے دل میں تنگی محسوس نہیں کرنی چاہئے اللہ کے لئے خلوصِ دل سے کام کرنا مسلمانوں کی خیر خواہی کرنا اور جماعتِ مسلمین کے ساتھ وابستہ رہنا کیونکہ ان کی دعوت اسے احاطے میں رکھتی ہے اور گمراہی سے محفوظ رکھتی ہے۔"

حدیثِ مذکور پر بعض معاصرین کی تنقید اور اس کا جواب

اس حدیث پر بھی بعض معاصرین نے تنقید کی ہے کہ یہ حدیث تاریخی حیثیت سے بوجوہِ ذیل مشکوک ہے:

۱- اس حدیث کے پہلے حصے میں بیان کیا گیا ہے کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے صحابہ بعد میں آنے والوں کی نسبت صفتِ تفقہ سے محروم تھے، اس میں صحابہ کی توہین پائی جاتی ہے، یہ حدیث صرف اس زمانے میں ظہور پذیر ہو سکتی تھی جب کہ مسلمانوں میں اعلیٰ درجے کی فقہی ذہانت پیدا ہوئی اور عالمِ اسلام میں مصر سے عراق تک فقہی آراء کے بہترین مذاہب نشوونما پانا شروع ہو گئے۔

۲- یہ حدیث رسولِ اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ کا ایک ایسا مرقع پیش کرتی ہے جو سرتا پا مصنوعی ہے، رسول اللہ ﷺ کو یہاں اس طرح کی تقریریں کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے جن کا عہدِ رسالت کے مسلمانوں کی فوری ضروریات سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ جن کا مقصد یہ معلوم ہوتا تھا کہ امت انہیں لفظ بہ لفظ محفوظ رکھے تاکہ آئندہ نسلوں تک انہیں منتقل کیا جاسکے کیونکہ وہی ان کے مفہوم کو بہتر طریقہ پر سمجھ سکیں گے۔

مذکورہ بالا تنقید کے بارے میں بھی ہم یہی کہیں گے کہ اس کی بنیاد کسی ٹھوس اصول، داخلی یا خارجی شہادت پر نہیں بلکہ ایک مفروضہ اور فکری واہمہ پر ہے، پہلے سے یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ یہ حدیث کسی ایسے دور میں وضع کی گئی جب کہ فقہ کا دور دورہ تھا، اس مفروضہ کی بنا پر جھٹ یہ فتویٰ صادر کردیا گیا کہ یہ تاریخی شہادت کی رو سے صحیح نہیں لیکن وہ تاریخی شہادت پیش نہیں کی گئی۔

اس حدیث کے مشکوک ہونے کی ایک دلیل یہ بھی دی گئی ہے کہ اس میں صحابہ رسول ﷺ کی تنقیص وتوہین کا پہلو پایا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک مغالطہ ہے فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ اِلٰی مَنْ هُوَ اَفْقَهُ مِنْهُ[1] سے یہ مفہوم اخذ کرنا قطعاً درست نہیں کہ بعد کے لوگ صحابہ سے تفقہ فی الدین میں زیادہ ہوں

---

[1] صحیح بخاری، ج ۲: ص ۱۰۷۷۔

گے، اس میں صرف اتنی بات بتائی گئی ہے کہ علم ودانش کی بات پہنچانے والا بعض اوقات کم فقیہ ہوتا ہے اور جس تک اس بات کو پہنچاتا ہے وہ زیادہ سمجھدار ہوتا ہے، خود صحابہ بھی ایک دوسرے تک حدیثیں پہنچاتے تھے، روایۃ الصحابی عن الصحابی (ایک صحابی کی دوسرے صحابی سے روایت) کی بہت سی مثالیں کتبِ حدیث میں ملتی ہیں، کئی صحابہ کرام نے آپس میں باریاں مقرر کر رکھی تھیں وہ باری باری بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوتے اور دوسرے ساتھی تک دین کی بات پہنچاتے چنانچہ حضرت عمر اور ان کے انصاری ساتھی کا قصہ صحیح بخاری میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے، انہوں نے بھی آپس میں باری مقرر کر رکھی تھی۔ ایک دن ایک صاحب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سن جاتے اور دوسرے کو جا کر سناتے، دوسرے روز دوسرے صاحب ایسا کرتے۔

امام شمس الدین ذہبی نے حضرت براء بن عازب انصاری سے روایت کیا ہے [1] کہ ہم نے ساری حدیثیں رسولِ کریم ﷺ سے نہیں سنیں، بعض اوقات دوسرے صحابی بھی ہمیں حضور علیہ السلام کی احادیث سناتے تھے۔

غرضیکہ یہ امر ثابت شدہ ہے کہ صحابہ ایک دوسرے تک سنت وحدیث پہنچاتے تھے اور ان میں فقاہت ودانش کے اعتبار سے ضرور فرق

---

[1] تلخیص المستدرک (ذہبی) ج ۱: ۹۵۔

تھا، خلفاء راشدین و دیگر مجتہدین صحابہ دوسرے صحابہ سے فقاہت و دانش میں اونچا مقام رکھتے تھے۔ حدیثِ مذکور میں اسی تفاوت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس سے صحابہ کی تنقیصِ شان لازم نہیں آتی البتہ فرقِ مراتب ضرور ثابت ہوتا ہے اور یہ امرِ مسلّم ہے۔

ع - گر فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی

اس حدیث کو اس وجہ سے بھی غیر صحیح قرار دیا گیا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کا کام اس قسم کی تقریریں کرنا اور صحابہ کا کام انہیں یاد کرنا اور دوسروں تک پہنچانا نہیں تھا جیسا کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے لیکن یہ بات بھی حقیقت کے بالکل برعکس ہے۔ صحابہ کرام کے نزدیک بہترین شغل رسولِ اکرم ﷺ کے اقوال و افعال کو محفوظ رکھنا تھا، ایک تو اس لئے کہ وہ اپنی زندگیاں رسولِ اکرم ﷺ کے اقوال و افعال کے سانچے میں ڈھالنا اپنا فرض سمجھتے تھے، دوسرے اس لئے بھی کہ وہ دین کے اولین داعی تھے اور مبلغ بھی، اور یہ دین کتاب و سنت کی صورت میں انہیں ملا تھا اگر وہ اسے محفوظ نہ کرتے تو یہ دین ہم تک کیسے پہنچتا؟

رہا یہ امر کہ حضور علیہ السلام اس قسم کی تقریریں نہیں کرتے تھے جن میں اپنے اقوال کو یاد کرنے پر زور دیا گیا ہو، یہ بھی محض مفروضہ پر مبنی ہے اس لئے کہ نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مَقَالَتِيْ سے مقصود حفاظتِ سنت ہے جو دین کا

اہم جزو ہے، حضور ﷺ اگر اپنے اقوال و افعال کو محفوظ رکھنے کا امر فرمائیں تو اس سے مقصود دین کو محفوظ کرنے کے سوا کچھ نہیں لہٰذا یہ ارشاد مزاجِ رسول علیہ السلام کے منافی نہیں بلکہ سو فیصد عین مطابق ہے۔

غرضیکہ معاصرِ موصوف کی یہ تنقید کوئی وزن نہیں رکھتی جس کی بنا پر اس حدیث کو مجروح یا مطعون قرار دیا جا سکے۔

حدیثِ مذکور کے شواہد

امام بخاری نے صحیح بخاری کتاب العلم میں تعلیقاً فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ اِلٰی مَنْ هُوَ اَفْقَهُ مِنْهُ کی روایت کو ذکر کیا ہے۔ امام ابوعبداللہ حاکم نیشاپوری نے حضرت جبیر بن مطعم سے یہی حدیث قدرے تغیرِ الفاظ سے روایت کی ہے اور شیخین (بخاری و مسلم) کی شرط پر اسے صحیح کہا ہے [1] اسی طرح سنن ابوداؤد اور ترمذی میں بھی یہ روایت حضرت زید بن ثابت سے مروی ہے [2] البتہ اس میں آخری ٹکڑا (ثَلٰثٌ لَا یَغُلُّ عَلَیْهِنَّ قَلْبُ مُسْلِمٍ) مذکور نہیں ہے۔

غرضیکہ اس روایت کی صحت سند اور متن کی رو سے شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ اس سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ حضور علیہ السلام اپنی سنت کو لاوارث نہیں چھوڑ گئے بلکہ اس کی حفاظت کا ایسا

---

[1] مستدرک حاکم، ج ۱، ص ۸۶۔ [2] سنن ابی داؤد، ج ۲ : ۲۸۹۔ جامع ترمذی، ج ۲ : ۹۵۔

بندوبست کر گئے کہ منکرین کے انکار اور محرفین کی تحریف کے باوجود آج تک سنت ایک حقیقت ثابتہ اور حجت شرعیہ ہے اور انشاء اللہ قیامت تک اس کی عظمت و شان یونہی برقرار رہے گی۔

دورِ فتن میں تمسّک بالسّنۃ کی خصوصی تاکید

رسولِ اکرم ﷺ نے اپنی اُمت کو تاکید فرمائی ہے کہ وہ فتنوں کے زمانے میں بدعات سے بچیں اور رسولِ اکرم ﷺ کی سنت کو اپنائیں، یہی سنت انہیں مرکزیت مہیا کرے گی اور ان کے شیرازہ کو یکجا رکھے گی، سنن ابو داؤد میں حضرت عرباض بن ساریہ سے مروی ہے:

قَالَ صَلّٰی بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ذَاتَ يَوْمٍ ثُمَّ اَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهٖ فَوَعَظَنَا مَوْعِظَةً بَلِيْغَةً ذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُوْنُ وَوَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوْبُ فَقَالَ رَجُلٌ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ كَاَنَّ هٰذِهٖ مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ فَاَوْصِنَا فَقَالَ اُوْصِيْكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَاِنْ كَانَ عَبْدًا حَبْشِيًّا فَاِنَّهٗ مَنْ يَعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِیْ فَسَيَرٰی اِخْتِلَافًا كَثِيْرًا فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ تَمَسَّكُوْا بِهَا وَعَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ وَاِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ فَاِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ۔[1] (رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیْ

---

[1] سنن ابی داؤد (کتاب السنۃ) ج ۲: ص ۵۰۶۔

وَابْنُ مَاجَةَ اَيْضًا اِلَّا اَنَّهُمَا لَمْ يَذْكُرَا الصَّلٰوةَ)

''عرباض بن ساریہ فرماتے ہیں رسولِ اکرم ﷺ نے ایک دن حسبِ معمول نماز پڑھائی، پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے اور ایسی بلیغ نصیحت فرمائی کہ جس سے ہمارے آنسو بہہ نکلے اور دل دہل گئے، کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ! گویا یہ جدا ہونے والے کی پند و موعظت ہے، براہِ کرم کچھ وصیت فرمایئے، آپ نے فرمایا میں تمہیں اللہ سے ڈرنے کی تاکید کرتا ہوں اور حاکم کی اطاعت کا حکم دیتا ہوں چاہے کوئی حبشی غلام بھی تمہارا حاکم بن جائے، جو شخص میرے بعد زندہ رہا، اُمت میں اختلافِ کثیر دیکھے گا لہٰذا تم پر لازم ہے کہ میرے طریقے اور میرے خلفاء راشدین کے طریقے کو لازم پکڑو، اسی کو تھامے رہو اور اسے دانتوں میں سختی سے دبائے رہو اور اپنے آپ کو نو پید ا امور سے بچائے رکھو کیونکہ دین میں اختراع شدہ باتیں بدعت ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔''[1]

---

[1] ''ہر بدعت گمراہی ہے'' اس قسم کی متعدد روایات ملتی ہیں جن میں محدثات امور کو بدعت کہا گیا ہے لیکن یاد رہے محدثات سے مراد ہر نئی چیز نہیں ورنہ بہت سے مباح امور بھی بدعت قرار پائیں گے، علامہ قسطلانی شارح بخاری نے بدعت کی تشریح و تقسیم کرتے ہوئے فرمایا ''البدعة كل شيئ على غير مثال سبق و فى الشرع فليس احداث مالم يكن فى عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم فان كان له اصل يدل عليه الشرع فليس ببدعة قال امامنا الشافعى رحمة الله عليه البدعة بدعتان محمودة وملمومة فما وافق السنة فهو محمود وماخالفها اخرجه ابونعيم بمعناه من طريق ابراهيم بن الجنيد عن الشافعى وعند البيهقى فى مناقب الشافعى انه قال المحدثات ضربان مااحدث مخالفا كتابا او سنة اواثرا اوجماعا فهذه بدعة الضلالة و ماحدث من الخير لايخالف شيئا من ذلك فهذه

(اس حدیث کو ابوداؤد کے علاوہ امامِ احمد، امام ترمذی اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے البتہ ترمذی اور ابن ماجہ میں خطبہ سے پہلے نماز کا ذکر نہیں)

یہاں پر یہ بات خصوصیت سے قابل غور ہے کہ حضور علیہ السلام نے اپنی سنت کے ساتھ خلفاء راشدین کی سنت کا بھی ذکر فرمایا، خلفاء راشدین کی سنت کیا چیز ہے؟ یہ سنتِ نبوی سے الگ چیز نہیں کیونکہ خلفاء راشدین نے اسی طریقہ اور راہِ عمل کو اپنایا جو رسولِ اکرم ﷺ نے تجویز فرمایا تھا، بات صرف یہ ہے کہ حضور ﷺ کی بعض سنتیں جو عہد رسالت میں زیادہ مشہور نہ ہوئیں، خلفاء راشدین کے دور میں زیادہ مشہور ہوگئیں [1] اور ان پر پوری پابندی سے عمل کیا گیا جیسے تراویح کی جماعت، رسول خدا ﷺ نے اس پر مواظبت نہیں فرمائی تا کہ کہیں فرض نہ ہو جائے [2] بعد میں فرضیت کا اندیشہ نہ رہا اس لئے

محدثة غیر مذمومة" (قسطلانی شرح بخاری ج ۱: ص ۳۰۲) امام قسطلانی کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ وہ نئے امور جو کتاب و سنت یا اثر و اجماع کے منافی ومخالف ہوں، بدعت ضلالت ہیں اور جو ایسے امور کتاب و سنت کے مخالف نہ ہوں بدعت ضلالت نہیں بلکہ بدعت محمودہ ہیں، یہی بات علامہ نووی نے شرح مسلم میں کہی ہے۔ ہندوستان کے عظیم محدث شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں:

"بدانکہ ہر چیز پیدا شد بعد از پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بدعت است و از آنچہ موافق اصول و قواعد سنت است و قیاس کردہ شدہ است برآں آنرا بدعت حسنہ گویند و آنچہ مخالف آن باشد بدعت ضلالت خوانند و کل بدعة ضلالة محمول برین است"۔ (اشعۃ اللمعات، ج ۱: ۱۳۵)

ان اکابر محدثین کے اقوال کی روشنی میں ان تنگ نظر حضرات کے تشدد کی حقیقت کھل جاتی ہے جو بدعت کے دائرے کو وسیع کر کے اہل سنت کے مشائخ کے معمولات کو بھی بدعت سیئہ قرار دیتے ہیں اور یونہی ان غلو پسند حضرات کے نظریے کی بھی تردید ہو جاتی ہے جو ہر بیہودہ رسم و رواج کو بدعت حسنہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو مسلک اعتدال پر قائم رکھے، آمین۔

---

[1] لمعات شرح مشکوٰۃ، ج ۱: ص ۲۳۰۔ [2] صحیح مسلم، ج ۱: ص ۲۵۹۔

دورِ فاروقی میں جماعت کا اہتمام کیا گیا۔

اسی طرح بعض ایسے امور بھی تھے جن کے بارے میں صحابہ کو قرآن وسنت سے واضح نص نہ ملی، انہوں نے اجتہاد و استنباط کر کے ایک اصول قائم کیا جس پر سب نے اتفاق کرلیا اور اسے سنتِ خلفاء راشدین کہا جانے لگا، یہ احوال بھی قرآن وسنت سے مستنبط ہوئے تھے، صحابہ کی طرف سے محض قیاسی باتیں نہیں ہوتی تھیں انہیں رسولِ خدا ﷺ نے اپنی سنت کیساتھ لاحق کر دیا، علامہ شاطبی حدیثِ مذکور نقل کر کے لکھتے ہیں۔

فَاَعْطَی الْحَدِیْثُ کَمَا تَرٰی اَنَّ مَاسَنَّهُ الْخُلَفَاءُ الرَّاشِدُوْنَ لَاحِقٌ بِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ [1]

”حدیث نے خلفاءِ راشدین کے مقرر کردہ طریقوں کو سنتِ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ لاحق کر دیا۔“

لہٰذا سنتِ نبویہ کے ساتھ خلفاء راشدین کی سنت کا الحاق صاحبِ وحی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قولِ مبارک سے ثابت ہے، اس سے انکار ممکن نہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ یہ حکم صرف خلفاءِ راشدین کے لئے نہیں بلکہ ہر دور میں اربابِ اقتدار کو حق پہنچتا ہے کہ وہ مرکزِ ملت کی حیثیت سے جس طرح مناسب سمجھیں، دین میں تبدیلی کر سکتے ہیں، کھلم کھلی جہالت اور تحریف فی الدین ہے، ہم آگے چل کر ثابت کریں گے کہ خلفاء

---

[1] الاعتصام، ج۱: ۱۲۷۔

راشدین نے سنتِ نبویہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور نہ ہی کبھی اپنی رائے کو سنتِ نبویہ پر ترجیح دی۔

حدیثِ مذکور کے بارے میں ایک شبہ کا ازالہ

چونکہ مذکورہ بالا حدیث میں یہ کہا گیا ہے کہ چاہے حبشی غلام بھی تمہارا امیر بن جائے تم اس کی اطاعت کرو۔ اس سے بعض تجدد پسند محققین (ڈاکٹر فضل الرحمٰن) کو یہ کہنے کا موقعہ مل گیا کہ یہ روایت اور اس قسم کی دوسری روایتیں جن میں حبشی کان کٹے غلام کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے جمہور اہلِ سنت کے مسلک کے خلاف ہیں کیونکہ جمہور اہل سنت کے نزدیک امارت کے لئے خاندانِ قریش کے کسی فرد کو منتخب کیا جاسکتا ہے[1] البتہ خوارج اس شرط کے خلاف ہیں لہٰذا یہ روایت محض خروج کی تحریک سے متاثر ہو کر تیار کی گئی ہے اور اہلسنت کی طرف سے خوارج کو اپنے ساتھ ملانے کی ایک عمدہ ترکیب ہے، ہم ان کی دقتِ نظری کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے لیکن کاش یہ دقتِ نظر دین فہمی کے لئے ہوتی اور غلط فہمیوں کے پھیلانے کے لئے نہ ہوتی۔

ع اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی

یہ اندازِ فکر مستشرقین سے مستعار لیا گیا ہے، اس اندازِ فکر کی رو سے محدثین کے اصولِ تنقید پر پرکھی ہوئی روایات کو محض ذہنی مفروضوں کی بنا پر چٹکیوں سے اڑا دیا جاتا ہے اور محدثین کے بارے میں اس قسم کی غلط فہمی

---

[1] شرح عقائد، ص ۱۱۲۔

پھیلائی جاتی ہے کہ انہوں نے حالات سے متاثر ہو کر یہ روایت تیار کی تھی (معاذ اللہ) مستند کتبِ تاریخ سے محدثینِ کرام کی دیانت و امانت اور حدیث رسول علیہ السلام کے بارے میں ان کی انتہائی شدید ورع و احتیاط کا اندازہ لگائیے اور پھر ان روشن دماغ، محققین کی غلط فہمیوں بلکہ بدگمانیوں کا جائزہ لیجئے تو حقیقت منکشف ہو جائے گی۔

مذکورہ روایت کے بارے میں دو جواب قابل غور ہیں، ایک تو یہ کہ اس حدیث میں حبشی غلام کا ذکر بطورِ مبالغہ ہے[1] کہ اگر بالفرض حبشی غلام بھی تمہارا امیر بن جائے یا یہ کہ خلیفہ وقت اسے کسی علاقے کا حاکم بنا دے تو تم اس کی اطاعت کرو۔ یاد رہے قرشی ہونا خلیفہ و امام کے لئے ضروری ہے نہ یہ کہ ہر حاکم کے لئے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ حدیث اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ، کا مفہوم یہ ہے کہ انتخاب کی صورت میں تمام لازمی اوصافِ امامت سے متصف خاندانِ قریش کے فرد کو منتخب کیا جائے لیکن اگر بصورت تسلط و تغلب کوئی حبشی غلام بھی تختِ امامت پر متمکن ہو جائے تو مرکزیت کو برقرار رکھنے کے لئے اور مسلمانوں کی صفوں کو انتشار سے بچانے کے لئے جائز امور میں اس کی اطاعت کی جائے۔

غور کرنے سے واضح ہو گا کہ دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں

---

[1] لمعات، ج ۱: ۲۳۰۔

اور نہ ہی ان میں مسلکِ اہل سنت سے انحراف اور خوارج کی تائید حاصل کرنے کا کوئی پہلو پایا جاتا ہے۔ یہ حدیث صحیح اس وقت سے روایت ہوتی چلی آرہی ہے جبکہ خارجیت کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ اس حدیث کو بعد کے دور کی پیداوار قرار دینا صرف انہی لوگوں کا نظریہ ہے جن کے اپنے خیالات یورپی دنیا کی پیداوار ہیں اور جن کے نزدیک غیر اسلامی مفکرین گولڈز ہر اور مسٹر شاخت کے علمی کارنامے، تو خلوصِ نیت پر مبنی ہیں مگر اکابر محدثین کی علمی کاوشیں عجمی سازش کا نتیجہ ہیں۔ ع

بریں عقل ودانش بباید گریست

عہدِ رسالت میں حدودِ مشاورت

عہدِ حاضر کے تجدد پسند عناصر یہ بھی کہتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے عہدِ رسالت میں بھی اہم امور کا فیصلہ صحابہ کے مشورے سے کرتے تھے، ارشادِ خداوندی بھی یہی تھا کہ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ، سورۂ ال عمران، ایت ۱۵۹۔ (آپ ان سے اہم امور میں مشورہ کر لیا کریں) رسولِ خدا ﷺ نے بھی اس ارشاد پر عمل کیا، آپ کے بعد بھی یہی سلسلہ جاری رہا لہٰذا اب بھی مجلس مشاورت اور پارلیمنٹ کے اراکین کو حق پہنچتا ہے کہ وہ دورِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق کتاب وسنت کی جدید تعبیر وتشریح کریں تا کہ ایک طرف اسلام کی جمہوریت نوازی کا ثبوت مل جائے اور دوسری

طرف سنتِ نبویہ میں حرکت وارتقاء کا سلسلہ پیدا ہو اور جمود ٹوٹ جائے۔ اس بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار ہونے کی بجائے ٹھوس حقائق کا جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ان تمام امور میں جن کا تعلق آئین سازی سے تھا یا قرآنی آئین کی تشریح سے، رسولِ اکرم ﷺ نے کبھی کسی سے مشورہ نہیں لیا بلکہ محض ربانی ہدایات کے مطابق کام کیا۔ آپ کو ایسی کوئی روایت نہ ملے گی کہ رسولِ اکرم ﷺ نے کسی قرآنی قانون کے بارے میں صحابہ سے پوچھا ہو کہ اس کی کیا تشریح کی جائے یا عبادات ومعاملات میں صحابہ سے مشورہ لیا ہو۔ اگر حضرتِ عمر ؓ یا کسی اور صحابی نے اس قسم کے امور میں اپنی رائے پیش کی (جیسا کہ روایات سے پتا چلتا ہے کہ پردے کے بارے میں اور مقامِ ابراہیم کو مصلّٰی (دوگانہ طواف پڑھنے کی جگہ) بنانے کے بارے میں حضرتِ فاروق اعظم ؓ نے اپنی رائے پیش کی تو رسولِ خدا ﷺ نے وحی کا انتظار کیا، وحیِ آسمانی نے فاروقی رائے کی موافقت[۱] کی تو ان دونوں باتوں کو عملی جامہ پہنایا گیا۔

کچھ حضرات کہتے ہیں اذان تو امورِ شرعیہ سے ہے اور اس کی موجودہ ہیئت صحابہ کے مشورہ سے طے ہوئی تھی لہٰذا امورِ شرعیہ میں مشورہ ثابت ہوگیا مگر یہ بھی ان کی خوش فہمی ہے۔ اذان کے بارے میں ابوداؤد

---

[۱] صحیح مسلم، ج۲: ص۲۷۶۔

و ترمذی و دیگر کتبِ حدیث میں جو روایات ملتی ہیں، ان کا ماحصل یہ ہے کہ کچھ لوگ جماعت کی خبر دینے کے لئے ناقوس بجانے کا مشورہ دیتے تھے کچھ آگ جلانے کا، ابھی کوئی بات طے نہیں ہوئی تھی۔

حضرت عبداللہ بن زید بن عبدربہ انصاری نے آکر خواب سنائی کہ میں نے عالمِ رؤیا میں ایک شخص کو ناقوس لے کر جاتے ہوئے دیکھا، میں نے پوچھا کیا تم اسے بیچو گے؟ اس نے کہا تم کیا کرو گے؟ میں نے کہا ہم اس کے ذریعے لوگوں کو نماز کے لئے بلائیں گے۔ اس نے کہا تمہیں اس سے بہتر طریقہ بتاؤں؟ چنانچہ اس نے کھڑے ہو کر اذان کے موجودہ کلمات سنا دیئے۔ صحابی نے صبح کو رسولِ خدا ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر خواب سنائی تو آپ نے فرمایا اِنَّھَا لَرُؤْیَا حَقٌّ[1] (یہ سچا خواب ہے) تم بلال کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ، اُسے کلمات سناتے جاؤ اور وہ اونچی آواز سے کہتا جائے۔ جب حضرت عمر ؓ نے یہ اذان سنی تو جلدی سے چادر گھسیٹتے ہوئے پہنچے اور حلفیہ بیان کیا کہ میں نے بھی یہی خواب دیکھا ہے۔ اس پر رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا فَلِلّٰہِ الْحَمْدُ (پس خدا کے لئے ساری حمد ہے)

ان احادیث سے تو اتنا ثابت ہوتا ہے کہ اذان مشورے سے نہیں بلکہ رؤیائے حق سے معرضِ وجود میں آئی۔ علامہ نووی شارحِ مسلم فرماتے ہیں کہ اذان میں صرف صحابی کے خواب پر عمل نہیں کیا گیا بلکہ حضورِ اکرم ﷺ کو وحی

---

[1] سننِ ابی داؤد، ج۱: ۷۲۔

ہوئی تھی یا آپ نے اجتہاد سے ایسا کیا تھا۔[1] ابوداؤد کے حاشیے میں ہے۔

اِنَّ عُمَرَ لَمَّا رَاٰی ذٰلِکَ الْاَذَانَ فِی الْمَنَامِ جَاءَ لِیُخْبِرَ النَّبِیَّ ﷺ فَوَجَدَ الْوَحْیَ قَدْ وَرَدَ بِذٰلِکَ.[2]

”حضرت عمر نے خواب میں اذان کی کیفیت معلوم کی، حضورِ اکرم ﷺ کو خبر دینے کے لئے حاضر ہوئے تو اس سے پہلے اذان کے بارے میں وحی آچکی تھی۔“

ان روایات کی روشنی میں یہ بات بالکل غلط ثابت ہوئی کہ اذان صحابہ کی مجلسِ شوریٰ نے تجویز کی تھی، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ اذان کا موجودہ طریقہ الہام یا وحیِ خفی سے طے ہوا، البتہ یہ بات مسلم ہے کہ حضور علیہ السلام تدابیر کے بارے میں اور جنگ کے بارے میں صحابہ سے مشورہ لیتے تھے اور قرآن کی مذکورہ آیت (**شَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ**) سے بھی یہی مراد ہے لیکن تدابیر جنگ وغیرہ کے بارے میں حضور علیہ السلام جو مشورہ لیتے تھے اس کے آپ پابند نہ تھے، اگر آپ کسی امر کا عزم فرما لیتے تو خدا پر توکل کر کے اسے کر گزرتے۔

امام بخاری نے صحیح بخاری میں رسولِ اکرم ﷺ کی مشاورت پر باب قائم کیا ہے جس کی افادیت واہمیت کے تقاضے کی بنا پر ہم اسے بعینہٖ نقل کرتے ہیں۔

بَابُ قَوْلِ اللّٰهِ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِی

---

[1] نووی شرح مسلم، ج ۱: ص ۱۶۴۔

[2] حاشیہ سنن ابی داؤد ج ۱: ص ۷۲۔

الْاَمْرِ وَاَنَّ الْمُشَاوَرَةَ قَبْلَ الْعَزْمِ وَالتَّبْيِيْنِ لِقَوْلِهٖ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِذَا عَزَمَ الرَّسُوْلُ لَمْ يَكُنْ بشر التقدم عَلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَشَاوَرَ النَّبِيُّ ﷺ اَصْحَابَهٗ يَوْمَ اُحُدٍ فِي الْمَقَامِ وَالْخُرُوْجِ فَرَاَوْا لَهُ الْخُرُوْجَ فَلَمَّا لَبِسَ لَاْمَتَهٗ وَعَزَمَ قَالُوْا اَقِمْ فَلَمْ يَمِلْ اِلَيْهِمْ بَعْدَ الْعَزْمِ وَقَالَ لَايَنْبَغِيْ يَلْبَسُ لَاْمَتَهٗ فَيَضَعُهَا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ وَشَاوَرَ عَلِيًّا وَاُسَامَةَ فِيْمَا رَمٰى بِهٖ اَهْلُ الْاِفْكِ عَائِشَةَ فَسَمِعَ مِنْهُمَا حَتّٰى نَزَلَ الْقُرْاٰنُ فَجَلَدَ الرَّامِيْنَ وَلَمْ يَلْتَفِتْ اِلٰى تَنَازُعِهِمْ وَلٰكِنْ حَكَمَ بِمَا اَمَرَ اللّٰهُ وَكَانَتِ الْاَئِمَّةُ بَعْدَ النَّبِيِّ ﷺ يَسْتَشِيْرُوْنَ الْاُمَنَاءَ مِنْ اَهْلِ الْعِلْمِ فِي الْاُمُوْرِ الْمُبَاحَةِ لِيَاْخُذُوْا بِاَسْهَلِهَا فَاِذَا وَضَحَ الْكِتَابُ وَالسُّنَّةُ لَمْ يَتَعَدَّوْهُ اِلٰى غَيْرِهٖ اِقْتِدَاءً بِالنَّبِيِّ ﷺ (الحديث) [1]

"قرآنِ مجید نے امت کے لئے یہ قانون طے کیا ہے کہ ان کے معاملات باہمی مشوروں سے ہوں اور رسولِ اکرم علیہ السلام کے لئے بھی مشورہ کرنے کا حکم موجود ہے لیکن مشورے کا حکم عزمِ رسول ﷺ سے پہلے کا ہے، جب رسول ﷺ عزم کرلیں یا خدا کی صاف وحی آجائے تو اب مشورے کا لحاظ کچھ بھی نہیں بلکہ اب اس کے خلاف مشورہ دینا خدا ورسول کے مقابلے میں پیش دستی کرنا سمجھا جائیگا چنانچہ آنحضرت ﷺ نے غزوۂ احد

---

[1] صحیح بخاری شریف، ج ۱: ۱۳۸۔

میں جنگ کرنے کے لئے صحابہ کرام سے مشورہ لیا لیکن جب آپ نے جنگ کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا اور ہتھیار پہن لئے تو کچھ لوگوں نے شہر میں رہنے کا مشورہ دیا۔ آپ نے اس پر عمل نہ کیا اور فرمایا یہ بات نبی کی شان سے بعید ہے کہ جب ایک مرتبہ ہتھیار پہن لے تو خدا کے حکم کے بغیر انہیں اتار دے، اسی طرح حضرتِ عائشہ کے واقعہ افک میں بھی آپ نے حضرت علی اور حضرتِ اسامہ سے مشورہ کیا لیکن جب قرآن نازل ہوگیا (اور مسئلہ براءت واضح ہوگیا) تو آپ نے ان کی رائے کی طرف توجہ نہ دی اور قرآن کے مطابق بہتان تراشی کرنے والوں کو حدِ قذف لگانے کا حکم دیا، یہی دستور آپ کے بعد خلفاء راشدین کا تھا وہ بھی امت کے امین اور اہل رائے لوگوں سے امورِ مباحہ کے بارے میں مشورہ لیتے تاکہ ان میں نسبتاً آسان امر کو اختیار کیا جائے لیکن جب کتاب وسنت سے کوئی مسئلہ واضح ہوکر سامنے آجاتا تو حضور علیہ السلام کی اقتداء کرتے ہوئے اس سے ذرہ بھر بھی تجاوز نہ کرتے۔"

ائمہ مسلمین کا جو دستور امامِ بخاری نے ذکر کیا ہے اسے علامہ شاطبی نے بھی الاعتصام میں نقل کیا ہے [1] امامِ بخاری کی عبارت کی روشنی میں مشاورت کے حدود متعین ہوجاتے ہیں اور حسبِ ذیل نکات کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔

(۱) رسولِ اکرم ﷺ کا مشورہ عزمِ راسخ سے پہلے ہوتا جب آپ عزمِ

---

[1] الاعتصام، ج۱: ۳۴۔

راسخ فرماتے تو پھر کسی کے مشورے سے اس میں تبدیلی نہیں کرتے تھے۔

(۲) رسولِ اکرم ﷺ امورِ شرعیہ میں وحی کا انتظار فرماتے تھے اپنے علم یا مشورۂ صحابہ کی بنا پر قطعی فیصلہ نہیں فرماتے تھے، مثال کے طور پر حضرتِ عائشہ کی برأت پختہ طور پر آپ کے علم میں تھی اس لئے آپ نے فرمایا تھا وَاللّٰہِ مَا عَلِمْتُ عَلٰی اَھْلِیْ مِنْ سُوْءٍ[1] اسی طرح صحابہ کرام میں سے اہلِ رائے حضرات نے بھی برأت بیان کی، اس کا مقتضٰی یہ تھا کہ الزام تراشی کرنے والوں کو سزا دی جاتی مگر رسولِ اکرم ﷺ نزولِ وحی کے انتظار میں رہے، جب سورۂ نور کی آیات اتریں تو آپ نے حضرتِ عائشہ کی برأت کے قطعی فیصلے کے ساتھ قذف کرنے والوں کو حد بھی لگائی۔

(۳) امام بخاری اور علامہ شاطبی کی تصریح کے مطابق ائمہ مسلمین کا مشورہ صرف اربابِ امانت اور اصحابِ علم سے ہوتا تھا۔

(۴) یہ مشورہ احکامِ شرعیہ یا دستور اسلامی میں ترمیم کے لئے نہیں بلکہ مباح امور میں سے نسبتاً کسی زیادہ آسان امر کو اختیار کرنے کے بارے میں ہوتا تھا۔

(۵) کتاب وسنت کی واضح ہدایات سے ائمہ مسلمین قطعاً تجاوز نہیں کرتے تھے اور نہ ہی کسی ایسی رائے کو اہمیت دیتے تھے جو کتاب وسنت سے متصادم ہو۔

---

[1] جامع ترمذی، ج ۲ : ص ۱۷۰۔

(۶) ائمہ مسلمین کا طرزِ عمل بتاتا ہے کہ وہ قرآن کے ساتھ سنت نبوی کو بھی اپنے دستور کا بنیادی سرچشمہ سمجھتے تھے اور یہی بات مسلمانوں کے تعامل سے ثابت ہے۔

اب ہم اگلے باب میں تاریخی شواہد سے ثابت کردیں گے کہ خلفاء راشدین کی نظر میں سنتِ نبوی کا کیا مقام تھا، اس سے ہمارا مقصود ان تجدد پسند حضرت کے پیدا کردہ شکوک وشبہات کا ازالہ کرنا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ صحابہ کے نزدیک (معاذ اللہ) حضور ﷺ کی احادیث کی حیثیت محض وقتی اور ہنگامی نوعیت کی تھی اور وہ حالات کے مطابق سننِ نبویہ میں ترمیم وتنسیخ کرتے رہتے تھے۔ ہم انشاء اللہ ٹھوس تاریخی حقائق کی روشنی میں ان شبہات کی تردید کریں گے، ممکن ہے کچھ انصاف پسند طبائع ان تاریخی حقائق کی روشنی میں اپنے نظریے پر نظر ثانی کریں اور کم از کم ان نفوسِ قدسیہ پر بہتان تراشی نہ کریں جنہوں نے اتباعِ سنت کو اپنا نصب العین بنا رکھا تھا اور جن کی شیفتگی ووارفتگی کا یہ عالم تھا کہ سنتِ تشریعیہ تو بجائے خود افعالِ طبعیہ میں بھی حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی پیروی کرتے تھے۔

عاشقی محکم شو از تقلیدِ یار　تا کمندِ تو شود یزداں شکار

سنتِ رسول ﷺ کا مقام خلفاء راشدین کی نظر میں

صدیقِ اکبر کا پہلا تاریخی خطبہ

حضرت صدیقِ اکبر ؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد سب سے

پہلے جو خطبہ دیا تھا وہ یہ ہے:

اَمَّا بَعْدُ يَآاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ وُلِّيْتُ اَمْرَكُمْ وَلَسْتُ بِخَيْرِكُمْ وَلٰكِنْ نَزَلَ الْقُرْاٰنُ وَسَنَّ النَّبِيُّ ﷺ السُّنَنَ فَعَلَّمَنَا فَعَلِمْنَا اِعْلَمُوْا اَنَّ اَكْيَسَ الْكَيْسِ التَّقْوٰى وَاَنَّ اَحْمَقَ الْحُمْقِ الْفُجُوْرُ وَاَنَّ اَقْوٰىكُمْ عِنْدِى الضَّعِيْفُ حَتّٰى اٰخُذَ مِنْهُ الْحَقَّ وَاَنَّ اَضْعَفَكُمْ عِنْدِى الْقَوِىُّ حَتّٰى اٰخُذَ لَهٗ بِحَقِّهٖ اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا اَنَا مُتَّبِعٌ وَلَسْتُ بِمُبْتَدِعٍ فَاِنْ اَحْسَنْتُ فَاَعِيْنُوْنِىْ وَاِنْ زِغْتُ فَقَوِّمُوْنِىْ۔[1]

(حمد و ثنا کے بعد فرمایا) لوگو! مجھے تمہارا حاکم بنایا گیا ہے حالانکہ میں تم سب سے اچھا نہیں ہوں لیکن قرآن مجید نازل ہوا اور حضور ﷺ نے سنن، مقرر فرمائے، آپ نے ان کی تعلیم دی اور ہم نے ان کو سیکھا، یقین رکھئے سب سے بہترین دانش مندی تقویٰ میں ہے اور سب سے بڑی حماقت نافرمانی میں ہے تم میں قوی ترین میرے نزدیک کمزور ترین ہے یہاں تک کہ میں اس سے وہ حق وصول کرلوں جو اس نے غصب کر رکھا ہے اور تم میں کمزور ترین میرے نزدیک سب سے قوی ہے یہاں تک کہ میں اسے اس کا حق دلا دوں، یاد رکھو میں نقشِ قدم پر چلنے والا ہوں، نئی راہ نکالنے والا نہیں، اگر میں اچھا کام کروں تو میری امداد کرتے رہنا اور جب ٹیڑھا ہونے لگوں تو مجھے سیدھا کردینا۔

---

[1] طبقات ابن سعد، ج ۳: ص ۱۸۲۔ اعلام الموقعین، ج ۱: ص ۵۴۔

کس قدر ایمان افروز اور بلیغ خطبہ ہے! دستورِ مملکت کے بنیادی اصول اور خلافت کے منشور کو کس کمال خوبی اور جامعیت سے بیان کیا ہے، ان الفاظ پر دوبارہ غور کیجئے اِنَّمَا اَنَا مُتَّبِعٌ وَلَسْتُ بِمُبْتَدِعٍ، بصیرت صدیقی نے کس طرح اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے کہ خلیفہ فقط سنتِ نبویہ کا پیروکار ہوتا ہے وہ آپ کی مقرر کردہ راہ سے ایک انچ ادھر یا اُدھر نہیں ہٹ سکتا، جو لوگ مرکزِ ملت کا یہ تصور پیش کرتے ہیں کہ مرکزِ ملت ہی مطاعِ مطلق ہوتا اور اس کی اطاعت ہی رسول ﷺ کی اطاعت ہوتی ہے، وہ ذرا اسلام کے پہلے فرمانروا اور خلیفہ راشد کے خطبہ پر غور کریں، اس خطبے کے الفاظ ان کے نام نہاد تصورِ مرکزِ ملت، کی دھجیاں بکھیر رہے ہیں اور اس حقیقت کو واضح کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کا فرمانروا سنتِ رسول ﷺ کو نافذ کرنے کا ذمہ دار ہے اسے سنت میں کسی قسم کی ترمیم یا تنسیخ کا کوئی حق نہیں۔

صدیق اکبر ؓ کے فیصلوں کا انداز

حضرتِ صدیق اکبر ؓ کس طرح فیصلے کیا کرتے تھے اور حلِ مشکلات میں ان کا طریقِ کار کیا تھا؟ اس بارے میں اس عہد کے قریب ترین لوگوں (تابعین کرام) کا بیان سنئے مشہور تابعی محدث امام ابن سیرین (م ۱۱۰ھ) فرماتے ہیں۔

اِنَّ اَبَا بَكْرٍ نَزَلَتْ بِهٖ قَضِيَّةٌ فَلَمْ يَجِدْ لَهٗ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ اَصْلًا

وَلَا فِی السُّنَّةِ اَثَرًا اِجْتَهَدَ بِرَأْیِهٖ۔[1]

اسی طرح میمون بن مہران کا بیان ہے:

كَانَ اَبُوْ بَكْرٍ اِذَا وَرَدَ عَلَيْهِ خَصْمٌ نَظَرَ فِیْ كِتَابِ اللّٰهِ فَاِنْ وَجَدَ فِيْهِ مَا يَقْضِیْ قَضٰى بِهٖ بَيْنَهُمْ وَاِنْ لَّمْ يَجِدْ فِیْ كِتَابِ اللّٰهِ نَظَرَ هَلْ كَانَتْ مِنَ النَّبِیِّ ﷺ فِيْهِ سُنَّةٌ فَاِنْ عَلِمَهَا قَضٰى بِهَا فَاِنْ لَّمْ يَجِدْ فَخَرَجَ يَسْأَلُ الْمُسْلِمِيْنَ فَقَالَ اَتَانِیْ كَذَا وَكَذَا فَنَظَرْتُ فِیْ كِتَابِ اللّٰهِ وَفِیْ سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَلَمْ اَجِدْ فِیْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَهَلْ تَعْلَمُوْنَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَضٰى فِیْ ذٰلِكَ بِقَضَاءٍ فَرُبَمَا قَامَ اِلَيْهِ الرَّهْطُ فَقَالُوْا نَعَمْ فَقَضٰى فِيْهِ بِكَذَا وَكَذَا فَيَأْخُذُ بِقَضَاءِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ عِنْدَ ذٰلِكَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَعَلَ فِيْنَا مَنْ يَحْفَظُ عَنْ نَبِيِّنَا وَاِنْ اَعْيَاهُ ذٰلِكَ دَعَا رُؤُسَ الْمُسْلِمِيْنَ وَعُلَمَائِهِمْ فَاسْتَشَارَهُمْ فَاِذَا اجْتَمَعَ رَأْيُهُمْ عَلَى الْاَمْرِ قَضٰى۔[2]

”حضرت ابوبکر کے سامنے جب کوئی معاملہ پیش ہوتا تو اولاً کتاب اللہ میں اس کا حل تلاش کرتے، وہاں نہ ملتا تو سنتِ رسول اللہ ﷺ میں غور کرتے، وہاں سے اگر معلوم ہوتا تو اسی کے مطابق فیصلہ کر دیتے اور اگر سنت میں بھی آپ کو اس کا حل نہ ملتا تو پھر مجلسِ شوریٰ سے پوچھتے کہ میرے پاس فلاں معاملہ فیصلہ ہونے کے لئے آیا ہے، میں نے کتاب وسنت میں

---

[1] اعلام الموقعین، ج۱، ص۵۴۔ [2] کنز العمال، ج۸، ص۳۲۸۔ ازالۃ الخفاء، ج۳، ص۳۱۔ تاریخ الخلفاء، ص۴۳۔

غور کیا ہے لیکن اس کا حل نہیں ملا، کیا تمہیں معلوم ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس بارے میں کوئی فیصلہ فرمایا ہے؟ اس پر بعض اوقات کچھ لوگ بتا دیتے کہ ہاں اس معاملے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس طرح فیصلہ فرمایا تھا، آپ رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کو لے لیتے اور یہ کہتے کہ خدا تعالیٰ کا شکر ہے ہم میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشادات یاد ہیں، اگر اس معاملے میں کوئی صورت نظر نہ آتی تو سرکردہ مسلمانوں اور علماء کو بلا کر مشورہ فرماتے، جب وہ کسی امر کے متعلق اجتماعی طور پر رائے دے دیتے تو آپ اسی طرح فیصلہ کر دیتے۔"

(۱) اولاً خود کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ میں کسی مسئلے کا حل تلاش کرتے جو اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ آپ سنتِ رسول ﷺ کو حجتِ شرعیہ سمجھتے تھے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد بھی اس پر عمل کرنا ضروری سمجھتے تھے۔

(۲) ثانیاً دوسروں سے پوچھتے تھے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر خود علم نہ ہو اور دوسروں سے سنتِ نبوی کا پتا چل جائے تو بھی اس کی اتباع ضروری ہے جس طرح خود سننے کی صورت میں عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔

(۳) ثالثاً یہ کہ کتاب وسنت سے حل نہ ملنے کی صورت میں اہلِ حل وعقد اور علماء کرام کو جمع کر کے اجتہاد کے ذریعے اس مسئلے کا حل تلاش کیا جاتا، اس اجتہاد کا ماٰخذ بھی کتاب وسنت کے سوا کچھ نہ تھا، اس سے ثابت

ہو گیا کہ صحابہ کرام کسی مسئلہ کے حل کے لئے بھی چاہے اس کا تعلق عبادات سے ہو یا معاملات سے، سنتِ رسول سے سرِ موانحراف نہیں کرتے تھے۔

حافظ ابنِ قیم نے پوری تحقیق کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔

لَا یَحْفَظُ لِلصِّدِّیْقِ خِلَافُ نَصٍّ وَاحِدٍ اَبَدًا۔[1]

''حضرت صدیقِ اکبر ؓ سے کسی ایک نص کی مخالفت بھی ثابت نہیں ہو سکی۔''

دورِ صدیقی کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک دادی پوتے کی میراث کا مطالبہ لے کر آئی جس کی ماں مر چکی تھی، حضرتِ ابوبکر صدیق ؓ نے کہا میں کتاب اللہ میں کوئی ایسا حکم نہیں پاتا جس کی رو سے تجھے ماں کا حصہ پہنچتا ہو، پھر انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ رسولِ اکرم ﷺ نے تو اس معاملے میں کوئی حکم نہیں دیا اس پر مغیرہ بن شعبہ اور محمد بن سلمہ نے شہادت دی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دادی کو ایسی صورت میں چھٹا حصہ دیا ہے چنانچہ حضرتِ صدیق اکبر ؓ نے سنتِ نبوی کے مطابق فیصلہ کر دیا۔[2]

حدِّ اطاعتِ خلیفہ

حضرت انس بن مالک ؓ سے روایت ہے کہ بیعت کے دوسرے دن ہی حضرت صدیقِ اکبر ؓ نے اپنے خطبے میں فرمایا:

---

[1] اعلام الموقعین، ج ۴: ص ۱۲۰۔
[2] تذکرۃ الحفاظ، ج ۱: ص ۲۔

أَطِيْعُوْنِیْ مَا أَطَعْتُ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَإِذَا عَصَيْتُ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَلَا طَاعَةَ لِیْ عَلَيْكُمْ[1]

”تم میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا رہوں اور اگر میں اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری نہ کروں تو میری اطاعت تم پر لازم نہیں ہے۔“

اس طرح صدیق اکبر ؓ نے خلیفہ وقت کے لئے دائرۂ اطاعت مقرر فرما دیا اور سب پر واضح کر دیا کہ اصل مطاع اللہ و رسول ہی ہیں، سربراہِ مملکت کی اطاعت اسی دائرے کے اندر رہ کر کی جا سکتی ہے اور اس سے انحراف کی صورت میں اس کے حکم کی تعمیل نہیں کی جا سکتی۔

لشکرِ اسامہ کی روانگی

مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرتِ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی قیادت میں لشکر بھیجنے کا فیصلہ خود سرکارِ دو عالم ﷺ نے وصال سے پہلے فرما دیا تھا، آپ کے وصال کے بعد فتنۂ ارتداد کی آگ بھڑک اٹھی، اس وقت خانہ جنگی کا شدید خطرہ تھا، حالات کے رخ اور مصلحتِ وقت کا تقاضا تھا کہ اس لشکر کی روانگی کو ملتوی کر دیا جاتا چنانچہ حضرت عمر و دیگر صحابہ نے رائے بھی دی اور ان خطرات کی طرف توجہ بھی دلائی جو اس وقت درپیش تھے مگر اتباع

---

[1] انساب الاشراف، ج۱: ص۵۹۱۔ تاریخ الخلفاء، ص۵۱۔ الکامل (ابن اثیر) ج۲: ۲۲۵۔

سنت کے اس عظیم پیکر نے جواب دیا:

لَوْ خَطَفَتْنِیَ الْکِلَابُ وَالذِّئَابُ لَمْ اَرُدَّ قَضَاءً قَضٰی بِہٖ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ۔[1]

”چاہے کتے اور بھیڑیے بھی ہمیں اچک لے جائیں تو میں اس فیصلے کو نہ بدلوں گا جو رسول اللہ ﷺ نے کر دیا تھا۔“

حضرتِ عمر بن خطاب نے خواہش ظاہر کی کہ کم از کم نوجوان اسامہ کو قیادت سے الگ کر دیں کیونکہ سن رسیدہ اکابر صحابہ کو ان کی قیادت میں جانا پسند نہیں، اس پر حضرتِ صدیق اکبر جلال میں آ گئے اور فرمایا:

ثَکِلَتْکَ اُمُّکَ یَا ابْنَ الْخَطَّابِ اُؤْمِرُ غَیْرَ اَمِیْرِ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ۔[2]

”خطاب کے بیٹے! تیری ماں تجھے روئے اور کھو دے کیا رسولِ اکرم ﷺ کے مقرر کردہ امیر کو چھوڑ کر کسی اور کو امیر بناؤں؟“

غرضیکہ حضرتِ صدیق اکبر نے ایسے نازک موقع پر بھی اتباعِ سنت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

جُرمِ عشق

کون نہیں جانتا کہ حضرتِ صدیق اکبر نے حضرتِ فاطمۃ الزہراء کو

---

[1] الکامل، ج۲: ص۲۲۶۔

[2] البدایۃ النہایۃ، ج۶: ص۳۰۵

میراث دینے سے اس لئے انکار کردیا تھا کہ انہیں رسولِ اکرم ﷺ کا ارشاد یادتھا کہ انبیاء کے ترکہ میں وراثت نہیں چلتی۔ آپ نے اس موقف سے ہٹنا گوارا نہ کیا، [۱] حضرتِ فاطمۃ الزہراء اور خاندانِ اہلِ بیت کے دیگر افراد تو سمجھ گئے لیکن بعض محبانِ اہلِ بیت آج تک نہیں سمجھے اور صدیقِ اکبر کو اتباعِ سنت کے 'جرم' میں سب وشتم کئے جارہے ہیں۔

خدا گواہ کہ گر جرمِ ما ہمیں عشق است
گناہِ گبر ومسلماں بجرمِ ما بخشند

---

[۱] حدیث لانورث ماترکناہ صدقۃ بخاری ومسلم میں موجود ہے، علمائے شیعہ کی مستند کتاب الکافی میں امام جعفر صادق سے مروی ہے ان الانبیاء لم یورثوا دینارا ولا درھما الماورثوا العلم، اس سے بھی علماء اہل سنت کی تائید ہوتی ہے، بعض حضرات محدثین کا کہنا ہے کہ حضرت سیدۃ النساء ودیگر افرادِ اہل بیت ماترکنا کو عام مخصوص البعض سمجھتے تھے جبکہ صدیق اکبر اسے عموم پر رکھتے تھے ان کا موقف یہی تھا کہ اموالِ فدک وغیرہ میں بعینہ وہی طریقہ کار رکھا جائے جسے حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا تھا، یہ صحیح ہے کہ بخاری ومسلم میں فلم تکلم کے الفاظ مروی ہیں جس سے حضرت سیدہ کی ناراضگی اور ترک مفہوم ہوتا ہے مگر یہ نہ تو حضرت عائشہ کے الفاظ ہیں اور نہ بی بی فاطمہ کے، ہوسکتا ہے جناب عروہ یا کسی اور راوی کا تاثر ہو۔ علماء اہل سنت وعلماء شیعہ کی کتابوں سے حضرت صدیق اکبر کا حضرت سیدہ کے گھر جانا اور انہیں راضی کرنا ثابت ہے، اہل سنت کی کتب مدارج النبوۃ، کتاب الوفاء بیہقی میں حضرت صدیق اکبر کا جاکر سیدہ کو راضی کرنا ثابت کیا گیا ہے، اسی طرح شیعہ امامیہ میں صاحب معراج السالکین کی روایت ہے: فرضیت بذٰلک (تحفہ اثنا عشریہ ص ۵۷۹)

اس مقام پر ہمارا مقصود اس نزاعی بحث کو طول دینا نہیں بلکہ صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ حالات کی انتہائی نزاکت کے باوجود بھی حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع پر قائم رہے۔ ۱۲

مانعینِ زکوٰۃ سے قتال

اس تاریخی حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ جب حضرتِ صدیق اکبر نے مانعینِ زکوٰۃ سے جہاد کرنا چاہا تو حضرت عمر نے عرض کیا کہ آپ قتال کیوں کرتے ہیں جبکہ وہ خدا کی توحید اور آنحضرت کی رسالت کی شہادت دیتے ہیں، اس پر حضرت صدیقِ اکبر نے جواب دیا:

وَاللّٰہِ لَوْ مَنَعُوْنِیْ عِنَاقًا (وَفِیْ رِوَایَۃٍ عِقَالًا) کَانُوْا یُؤَدُّوْنَہَا اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ لَقَاتَلْتُہُمْ۔[1]

"خدا کی قسم اگر وہ بھیڑ کا بچہ یا اونٹ کی رسی بھی دینے سے انکار کریں گے جسے وہ بارگاہِ رسالت میں پیش کیا کرتے تھے تو میں اس پر بھی ان سے قتال کروں گا۔"

یہ ہے حضرت صدیقِ اکبر کا قول و فعل جو انہوں نے رسولِ اکرم ﷺ کے خلیفہ اوّل ہونے کی حیثیت سے پیش کیا، اسے بھی سامنے رکھیے اور پھر منکرین سنت کے اس دعویٰ کا بھی جائزہ لیجیے کہ معاذ اللہ خلفاء راشدین اپنے آپ کو رسولِ اکرم ﷺ کے فیصلوں کو بدلنے کا مجاز سمجھتے تھے، یہ ان نفوسِ قدسیہ پر بہتان تراشی نہیں تو اور کیا ہے؟

آیئے اب خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے طریق کار

---

[1] البدایۃ والنہایۃ، ج۶: ص۳۱۱۔

پر تھوڑی سی نظر ڈالیں۔

۱- میمون بن مہران بیان کرتے ہیں:

اِنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ كَانَ يَفْعَلُ ذٰلِکَ فَاِنْ اَعْيَاهُ اَنْ يَجِدَ فِی الْقُرْاٰنِ وَالسُّنَّةِ نَظَرَ هَلْ كَانَ لِاَبِیْ بَكْرٍ فِيْهِ قَضَاءٌ فَاِنْ وَجَدَ اَبَا بَكْرٍ قَدْ قَضٰی فِيْهِ بِقَضَاءٍ قَضٰی بِهٖ وَاِلَّا دَعَا رُؤُسَ الْمُسْلِمِيْنَ وَعُلَمَائَهُمْ وَاسْتَشَارَهُمْ فَاِذَا اجْتَمَعُوْا عَلَی الْاَمْرِ قَضٰی بَيْنَهُمْ۔[1]

حضرتِ فاروق اعظم بھی صدیق اکبر کی طرح اولاً کتاب وسنت میں مسئلے کا حل تلاش کرتے، اگر اس میں اپنے آپ کو عاجز پاتے تو پھر عہد ابو بکر کے فیصلے کو پیشِ نظر رکھتے، اگر انہیں اس بارے میں عہدِ صدیقی کا کوئی فیصلہ نہ ملتا تو سرکردہ مسلمانوں اور علماء صحابہ کو بلاتے اور ان سے مشورہ کرتے اور جب وہ کسی امر پر متفق ہو جاتے تو اسی کے مطابق فیصلہ کر دیتے۔

دیکھئے فاروقِ اعظم ؓ نے کس طرح سنتِ نبوی کو اپنے لئے نصب العین بنایا تھا، حضرت عمر کا دورِ صدیقی کے فیصلوں کو پیش نظر رکھنا بھی اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ آپ کتاب وسنت کی پیروی کے ساتھ ساتھ اپنے پیش رو کے فیصلوں کو بھی بہت اہمیت دیتے تھے اس لئے کہ ان کا ماخذ بھی کتاب وسنت کے سوا کچھ نہ تھا اس لئے وہ بھی شرعی اعتبار سے سند

---

[1] کنز العمال، ج ۵: ص ۳۴۸۔ ازالۃ الخفاء، ج ۲: ص ۳۱۔

کی حیثیت رکھتے تھے۔

۲- جو لوگ اتباعِ سنت کو عبادات تک محدود سمجھتے ہیں انہیں چاہیے کہ حسبِ ذیل واقعہ پر غور کریں جس کا تعلق معاشی نظام سے ہے۔

امام بخاری نے صحیح بخاری میں حضرت شیبہ بن عثمان کی یہ روایت بیان کی ہے کہ ایک بار فاروق اعظم نے کہا میں تہیہ کر چکا ہوں کہ کعبہ کے ہدایا وتحائف کے طور پر جو زر و مال موجود ہے، اسے مسلمانوں میں تقسیم کر دوں گا، شیبہ نے کہا آپ ایسا نہیں کر سکتے، حضرت عمر نے وجہ پوچھی شیبہ نے عرض کیا آپ کے دونوں پیش روؤں (صدیقِ اکبر اور رسولِ خدا ﷺ) نے ایسا نہیں کیا۔ اس پر حضرتِ عمر نے تائید کرتے ہوئے فرمایا:

هُمَا الْمَرْ ءُ انِ یُقْتَدٰی بِهِمَا۔[1]

"یہی وہ دونوں مردانِ خدا ہیں جن کی اقتداء کی جائے۔"

حافظ ابن حجر عسقلانی اس حدیث کی تشریح میں نکتہ آفرینی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قُلْتُ وَتَمَامُهُ اَنَّ تَقْرِیْرَ النَّبِیِّ ﷺ مُنَزَّلٌ مَنْزِلَةَ حُکْمِهٖ بِاسْتِمْرَارِ مَاتَرَکَ تَغْیِیْرَهٗ فَیَجِبُ الْاِقْتِدَاءُ بِهٖ فِیْ ذٰلِکَ الْعُمُوْمِ لِقَوْلِهٖ تَعَالٰی وَاتَّبِعُوْهُ وَاَمَّا اَبُوْبَکْرٍ فَدَلَّ عَلٰی عَدَمِ تَعَرُّضِهٖ عَلٰی اَنَّهٗ لَمْ یَظْهَرْ لَهٗ مِنْ قَوْلِهٖ ﷺ وَلَامِنْ فِعْلِهٖ مَایُعَارِضُ التَّقْرِیْرَ الْمَذْکُوْرَ

---

[1] صحیح بخاری (مصری)۹:۱۱۳۔

وَلَوْ ظَهَرَ لَهُ لَفَعَلَهُ لَاسِيَّمَا مَعَ اِحْتِيَاجِهٖ لِلْمَالِ لِقِلَّتِهٖ فِيْ مُدَّتِهٖ۔[1]

"اس کی وجہ یہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے اس مال (نذرانہ کعبہ) کو تقسیم کئے بغیر رکھا، آپ کی یہ تقریر حکم کا درجہ رکھتی ہے اس لئے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے اس میں کوئی تبدیلی نہیں فرمائی لہٰذا اس میں بھی آپ کی پیروی ضروری ہے اور ارشادِ خداوندی "وَاتَّبِعُوْهُ" (حضور ﷺ کی پیروی کرو!) کا تقاضا بھی یہی ہے، حضرت ابوبکر صدیق نے بھی اس سے اس لئے تعرض نہیں فرمایا کہ انہیں بھی حضور علیہ السلام کے قول وفعل سے مذکورہ تقریر کے خلاف کوئی ثبوت نہیں پہنچا، اگر کوئی ثبوت مل جاتا تو ایسا کر لیتے خصوصاً جبکہ قلتِ مال کی وجہ سے ضرورت بھی تھی۔"

غرضیکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تقریر کو دونوں خلفاء نے برقرار رکھا اگرچہ اس بارے میں کوئی واضح ارشاد نہیں تھا لیکن صرف تقریرِ رسول بھی ان کی نظر میں انتہائی اہم تھی کہ ضرورت کے باوجود اس میں کوئی تبدیلی نہ کی۔ غور کا مقام ہے کہ اگر اتنی جزوی تبدیلی نہیں کی جا سکتی تو پورے معاشی نظام کو بدلنا کیونکر درست ہوگا؟

۳- حضرت فاروقِ اعظم کا گرامی نامہ کوفہ کے چیف جسٹس کے نام۔

حضرت امیر المؤمنین عمر بن خطاب، عدالتِ کوفہ کے چیف جسٹس قاضی شریح کو ایک مکتوبِ خاص میں تحریر فرماتے ہیں:

---

[1] فتح الباری شرح صحیح بخاری، ۱۳: ۲۱۳۔

اِذَا وَجَدْتَ شَیْئًا فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ فَاقْضِ بِہٖ وَلَا تَلْتَفِتْ اِلٰی غَیْرِہٖ وَاِنْ اَتَاکَ شَیْئٌ لَیْسَ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ فَاقْضِ کَمَا سَنَّ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ فَاِنْ اَتَاکَ مَالَیْسَ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ وَلَمْ یَسُنَّ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ فَاقْضِ بِمَا اَجْمَعَ عَلَیْہِ النَّاسُ وَاِنْ اَتَاکَ مَالَیْسَ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ وَلَا سُنَّۃِ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ وَلَمْ یَتَکَلَّمْ فِیْہِ اَحَدٌ قَبْلَکَ فَاِنْ شِئْتَ اَنْ تَجْتَھِدَ بِرَأْیِکَ فَتَقَدَّمْ وَاِنْ شِئْتَ اَنْ تَتَأَخَّرَ فَتَأَخَّرْ وما اَرَی التَّأَخُّرَ اِلَّا خَیْرًا لَکَ۔[1]

”جب تمہیں کتاب اللہ میں حکم مل جائے تو اس کے مطابق فیصلہ کر دو اور کسی اور چیز کی طرف دھیان نہ دو، اگر کتاب اللہ میں نہ ملے تو سنتِ رسول کے مطابق فیصلہ کرو اور اگر ایسا معاملہ ہو کہ کتاب و سنت سے اس کا علم نہ ہو سکے تو مسلمانوں کے اجماع کے مطابق فیصلہ کرو اور اگر اجماع بھی نہ پاؤ تو پھر تمہیں اختیار ہے یا تو خود اجتہاد کر کے آگے بڑھ جاؤ یا اس معاملے میں توقف کرو، میرے خیال میں تمہارا توقف کرنا زیادہ بہتر ہوگا۔“

۴۔ اسی طرح حضرت ابو موسیٰ اشعری کو آدابِ قضاء کی تعلیم دیتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں:

اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ الْقَضَاءَ فَرِیْضَۃٌ مُّحْکَمَۃٌ وَسُنَّۃٌ مُّتَّبَعَۃٌ۔[2]

---

[1] اعلام الموقعین، ۱: ص ۶۱، ۶۲۔ یسر الاسلام واصول التشریع العام، ص ۴۶۔ ازالۃ الخفاء، ۲: ص ۸۵۔

[2] اعلام الموقعین، ۱: ص ۸۵۔

”قضاء فریضہ محکمہ ہے یا سنتِ متبعہ“

یعنی فیصلہ کرنے کے لئے یا تو ان احکام کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے جو کتاب اللہ کی آیاتِ محکمات میں واضح کر دیئے گئے ہیں یا پھر سنتِ نبوی کی طرف رجوع کرنا چاہئے جو ہر حال میں قابلِ اتباع ہے ان دونوں میں مسئلے کا حل نہ مل سکے تو فہم و فکر سے کام لیتے ہوئے قیاس کرنا چاہئے اور ایک جیسے امور کا حکم علتِ مشترکہ کی بنا پر معلوم کر لینا چاہئے۔

۵۔ حضرت عمر نے ایک دفعہ سنت کا مفہوم واضح کرتے ہوئے فرمایا:

اَلسُّنَّةُ مَاسَنَّهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَلَاتَجْعَلُوْا خَطَأَ الرَّأْيِ سُنَّةً۔[۱]

”سنت تو اس طریقے کا نام ہے جو رسولِ اکرم ﷺ نے مقرر فرمایا تم غلط رائے کو سنت نہ بناؤ۔“

چونکہ کچھ لوگ قرآنی آیات میں مختلف احتمالات نکال کر اپنا موقف ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ ظواہرِ نصوص کو اپنا خیال درست ثابت کرنے کے لئے پیش کرتے ہیں، ان کے بارے میں فاروقِ اعظم نے اپنی فراست کی بنا پر پہلے سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا:

سَيَأْتِيْ قَوْمٌ يُجَادِلُوْنَكُمْ بِشُبُهَاتِ الْقُرْاٰنِ فَخُذُوْهُمْ بِالْاَحَادِيْثِ فَاِنَّ اَصْحَابَ السُّنَنِ اَعْلَمُ بِكِتَابِ اللّٰهِ۔[۲]

”ایک ایسی قوم بھی آئے گی جو قرآنی آیات سے شبہات ڈالنے کی

---

[۱] اعلام الموقعین، ۱: ۵۴۔

[۲] موافقات، ج ۴: ص ۱۷۔ کشف الغمہ، ۱: ص ۲۱۔

کوشش کرے گی، ان کا جواب یہی ہے کہ احادیث سے ان پر گرفت کرو کیونکہ اصحابِ سنن ہی کتاب اللہ کے صحیح عالم ہو سکتے ہیں۔"

حضرتِ فاروق اعظم کے ارشاد میں ان لوگوں کے لئے درسِ عبرت ہے جو ایک طرف تو حضرتِ فاروق اعظم کو شاہکارِ رسالت تسلیم کرتے ہیں مگر دوسری طرف حضور رسالت مآب ﷺ کی سنت کی اہمیت وعظمت کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور صرف کتاب اللہ کی روشنی میں خود ساختہ معارف وحقائق بیان کرتے ہیں۔ حضرت فاروقِ اعظم پوری صراحت کے ساتھ فرما رہے ہیں کہ ایک قوم قرآنی آیات سے شبہات ڈالنے کی کوشش کرے گی، ان پر احادیث سے گرفت کرنا۔ منکرینِ حدیث ذرا اپنے گریبان میں جھانکیں، کیا یہ وہی قوم نہیں ہیں، پھر ان کا قرآنی دعویٰ ہے اس بارے میں حضرت فاروقِ اعظم نے کیسی فیصلہ کن بات کہی ہے:

فَاِنَّ اَصْحَابَ السُّنَنِ اَعْلَمُ بِكِتَابِ اللّٰهِ.

"اصحاب سنن ہی کو کتاب اللہ کا زیادہ علم ہوتا ہے۔"

لہٰذا سنت وحدیث کا انکار کر کے یا ان کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کر کے آدمی مفسرِ قرآن نہیں بن سکتا۔

حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کا معیارِ انتخاب

حضرتِ عمر ؓ حکام اور امراء کے انتخاب میں کس چیز کو زیادہ اہمیت

دیتے تھے، اس کا اندازہ اس خطبے کے اقتباس سے لگایئے جو آپ نے خلافت کے آخری ایام میں دیا تھا، فرماتے ہیں:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اُشْھِدُکَ عَلٰی اُمَرَاءِ الْاَمْصَارِ فَاِنِّیْ اِنَّمَا بَعَثْتُھُمْ لِیُعَلِّمُوا النَّاسَ دِیْنَھُمْ وَسُنَّۃَ نَبِیِّھِمْ۔[1]

"الٰہی! میں تجھے گواہ بناتا ہوں کہ میں نے مختلف علاقوں میں حکام اور امراء کو اس لئے بھیجا ہے کہ وہ لوگوں کو دین سکھائیں اور سنتِ نبویہ کی تعلیم دیں۔"

اس میں آپ نے حکام اور امراء کے انتخاب کا مقصد بھی واضح فرمایا ہے اور ساتھ ہی یہ اشارہ بھی کر دیا ہے کہ حکام کے انتخاب کے وقت اس بات کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ کونسا فرد دین کی تعلیم دینے اور سنتِ نبویہ کی اشاعت کرنے میں زیادہ اہل ثابت ہوتا ہے۔

عمر فاروق اور احادیث نبوی کا احترام

حضرتِ فاروق اعظم کا عمل اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ آپ نے سنتِ نبویہ کے مقابلے میں کسی اجتہاد سے فیصلہ نہیں کیا بلکہ بارہا ایسا ہوا کہ آپ نے از روئے اجتہاد ایک بات کہنا چاہی لیکن حدیث وسنت میں اس کے خلاف ثبوت مل گیا تو فوراً اپنا موقف بدل کر سنت کے مطابق فیصلہ کر دیا،

---

[1] طبقات ابن سعد، ج ۳: ص ۳۳۹۔

سیرتِ فاروقی کا مطالعہ کرنے والے اس جملے سے ضرور آگاہ ہوں گے۔

لَوْ لَمْ نَسْمَعْ هٰذَا لَقَضَیْنَا فِیْهِ بِخِلَافِ ذٰلِکَ.[1]

''اگر ہمیں اس معاملے میں حدیث نہ پہنچتی، تو ہم اس کے خلاف فیصلہ دے بیٹھتے۔''

چنانچہ اس سلسلے میں ثبوت کے طور پر حضرتِ عمر کے طرزِ عمل کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) حضرت عمر مجوسیوں سے جزیہ لینے کے بارے میں تردد میں تھے ان سے جزیہ لینا چاہیے یا نہ؟ لیکن حضرتِ عبدالرحمٰن بن عوف نے اس بارے میں حدیث بیان کی تو آپ نے بلا تامل جزیہ لینے کا حکم دے دیا، چنانچہ امام غزالی لکھتے ہیں:

قَالَ عُمَرُ مَا اَدْرِیْ مَا اَضَعُ بِالْمَجُوْسِ وَلَیْسُوْا اَهْلَ الْکِتَابِ فَقَالَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ سُنُّوْا بِهِمْ سُنَّةَ اَهْلِ الْکِتَابِ.[2]

''حضرتِ عمر نے کہا میں نہیں جانتا مجوس کے بارے میں کیا کروں، وہ اہلِ کتاب نہیں ہیں۔ اس پر عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا کہ میں نے رسولِ اکرم ﷺ سے سنا ہے کہ ان کے ساتھ (جزیہ وغیرہ کے معاملے میں) اہلِ کتاب سا معاملہ کرو۔''

---

[1] المستصفیٰ (غزالی)، ج ۱: ۹۰۔

[2] المستصفیٰ، ج ۱: ص ۹۵۔ تخریج احادیث بزدوی، ص ۱۵۶۔

ظاہر ہے کہ جزیہ عبادات سے نہیں بلکہ مالیاتِ حکومت سے تعلق رکھتا ہے، اس بارے میں بھی حضرتِ عمر نے رائے پر عمل کرنے کی بجائے سنتِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنایا چنانچہ امامِ ابوداؤد فرماتے ہیں:

لَمْ يَكُنْ عُمَرُ يَأْخُذُ الْجِزْيَةَ مِنَ الْمَجُوْسِ حَتّٰى شَهِدَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَخَذَهَا مِنْ مَجُوْسِ هَجَرٍ۔[1]

"حضرت عمر مجوسیوں سے جزیہ نہیں لیتے تھے یہاں تک کہ عبد الرحمٰن بن عوف نے گواہی دی کہ رسولِ اکرم ﷺ نے علاقہ ہجر کے مجوسیوں سے جزیہ لیا تھا۔"

(ب) طاعون عمواس عہدِ فاروقی کا مشہور حادثہ ہے، اس طاعون میں سرزمینِ شام واردن میں موجود ہزاروں مجاہدین لقمہ اجل بن گئے، حضرتِ عمر نے اس موقع پر صحابہ سے طاعون زدہ علاقے میں داخل ہونے کے بارے میں مشورہ لیا، صحابہ کی رائے میں اختلاف تھا، آپ کا اجتہاد یہی تھا کہ ایسے علاقے میں داخل ہونے سے گریز کرنا چاہئے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی حدیث سے آپ کی رائے کی تائید ہوگئی، انہوں نے کہا:

اِنَّ عِنْدِيْ مِنْ ذٰلِكَ عِلْمًا سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ اِذَا سَمِعْتُمْ بِهٖ بِاَرْضٍ فَلَا تَقْدَمُوْا عَلَيْهِ وَاِذَا وَقَعَ بِاَرْضٍ وَاَنْتُمْ فِيْهَا فَلَا تَخْرُجُوْا فِرَارًا مِنْهُ.[2]

---

[1] سنن ابی داؤد، ج ۲: ص ۱۵۰۔ [2] البدایۃ النہایۃ، ج ۷: ص ۷۷۔

”میرے پاس اس بارے میں صحیح علم ہے، میں نے رسولِ اکرم ﷺ سے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ جب کسی علاقے میں یہ وبا پھوٹ چکی ہو، وہاں نہ جاؤ اور اگر وبا زدہ علاقے میں پہلے سے موجود ہو تو موت کے ڈر سے وہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کرو۔“

(ج) ایک مرتبہ ایک عورت نے عدالتِ فاروقی میں درخواست دائر کی کہ میرا خاوند قتل ہو گیا ہے، اس کا خون بہا ادا کیا گیا ہے لہٰذا مجھے اس خون بہا سے حصہ دیا جائے۔ حضرتِ عمر نے قیاسًا فرمایا کہ ایسا نہیں ہو سکتا اس لئے کہ وراثت مالِ متروکہ میں جاری ہوتی ہے اور خون بہا تیرے خاوند کا ترکہ نہیں لیکن اس وقت ضحاک بن سفیان نے حدیث سنائی کہ رسولِ اکرم ﷺ نے اشیم ضبابی کی اہلیہ کو اس کے مقتول خاوند کی دیت سے حصہ دیا تھا یہ سنتے ہی حضرتِ عمر نے اپنی رائے واپس لے لی اور اپنے آقا و مولیٰ ﷺ کے ارشاد کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔[1]

(د) جنین (شکم مادر میں موجود بچہ) کی دیت کے بارے میں ازروئے قیاس یہ بات سامنے آئی کہ اگر جنین زندہ ہو تو پوری دیت ادا کی جائے اور اگر مَرا ہوا ہے تو کچھ نہ دیا جائے لیکن جب آپ کو حمل بن مالک کی حدیث (اسے دیگر محدثین کے علاوہ امامِ مسلم نے بھی حضرت ابوہریرہ[2] رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے) پہنچی کہ مردہ جنین کی دیت میں غلام یا لونڈی کی

---

[1] الرسالۃ للشافعی، ص ۶۶۔ ازالۃ الخفاء، ۲: ص ۸۶۔ [2] صحیح مسلم، ج ۲: ص ۶۲۔

قیمت ادا کرنا چاہئے تو آپ نے اسی حدیث پر عمل کیا اور فرمایا:

كِدْنَا اَنْ نَقْضِىَ فِيْهِ بِرَأْيِنَا وَفِيْهِ سُنَّةٌ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ[1]

''قریب تھا کہ ہم اس بارے میں اپنی رائے سے فیصلہ کر بیٹھتے حالانکہ اس بارے میں رسولِ اکرم ﷺ کی سنت موجود تھی۔''

غرضیکہ اس قسم کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ حضرتِ فاروقِ اعظم نے حدیثِ نبوی کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا بلکہ اپنے قیاس کو حدیث کے سامنے ترک کر دیا۔

عقل قرباں کن بہ پیشِ مصطفٰے
حسبی اللہ گو کہ اللہ ہم کفٰے

منکرین سنت کے چند شبہات کا ازالہ

حضرت عمرؓ کے بارے میں بعض لوگوں نے کچھ روایات کو آڑ بنا کر یہ غلط فہمی پیدا کرنے کی ناکام کوشش کی ہے کہ آپ حدیث وسنت کو دین میں حجت خیال نہیں کرتے تھے، ہم ان روایات کو ذیل میں پیش کرتے ہیں تا کہ اس غلط فہمی کا ازالہ کیا جا سکے۔

۱۔ حضرت عمر بن خطابؓ نے فاطمہ بنت قیس کی حدیث کو جس کا مفہوم یہ تھا کہ مطلقہ بائنہ کے لئے شوہر کے ذمہ نان ونفقہ نہیں ہے اور نہ ہی

---

[1] الرسالۃ للشافعی، ص ۴۲۷۔ ازالۃ الخفاء، ۲: ص ۸۶۔

حق سکنٰی ہے، رد کر دیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مرورِ زمانہ کے ساتھ سنت میں تغیر کو جائز سمجھتے تھے مگر یہ شبہ حقیقت سے بالکل بعید ہے اس لئے کہ حضرت عمر بن خطاب ﷛ نے فاطمہ بنت قیس کی روایت پر اس لئے عمل نہیں کیا کہ آپ کی تحقیق کے مطابق وہ کتاب وسنت کے موافق نہیں تھی چنانچہ آپ نے فاطمہ بنت قیس کی روایت کو متروک قرار دیتے ہوئے فرمایا:

لَانَدَعُ کِتَابَ رَبِّنَا وَلَاسُنَّةَ نَبِيِّنَا بِقَوْلِ اِمْرَأَةٍ لَانَدْرِیْ اَحَفِظَتْ ذٰلِکَ اَمْ لَا۔[1]

"ہم اللہ کی کتاب اور سنتِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ایک عورت کے کہنے پر نہیں چھوڑ سکتے ہم نہیں جانتے کہ اسے بات یاد ہی یا نہ؟"

گویا حضرتِ عمر نے واضح فرما دیا کہ روایتِ فاطمہ بنت قیس چونکہ کتاب وسنت کی ان نصوص کے منافی ہے جن میں مطلقہ کے لئے نفقہ وسکنٰی ثابت کیا گیا ہے لہٰذا اس روایت پر عمل نہیں کیا جائے گا، اس سے تو الٹا تمسک بالسنہ کی اہمیت معلوم ہوتی ہے اور انکارِ سنت کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔

حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ سے استدلال

منکرین حدیث حضرت عمر کے اس جملے کو بڑے شد ومد کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے رسولِ اکرم ﷺ کے وصال سے پہلے فرمایا تھا،

---

[1] سنن ابی داود، ج۱: ۵۳۴۔

حسبنا کتاب اللہ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب اللہ کافی ہے، سنتِ رسول علیہ السلام کی کوئی ضرورت نہیں۔ اصل واقعہ جس کی تفصیل صحیح بخاری و صحیح مسلم میں موجود ہے یوں ہے کہ وصال سے پہلے جمعرات کے دن رسولِ خدا ﷺ کو درد کی تکلیف بڑھ گئی، آپ نے فرمایا میرے پاس کوئی چیز لے آؤ، تمہیں تحریر لکھ دوں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو گے، اس پر حضرتِ عمر نے کہا رسولِ اکرم ﷺ پر تکلیف کا غلبہ ہے، تمہارے پاس قرآن ہے ہمیں اللہ کی کتاب کافی ہے۔ اس پر گھر میں موجود افراد کے درمیان اختلاف ہوا، کچھ کا خیال تھا کہ تحریر کے لئے کوئی چیز لے آنی چاہئے اور کچھ وہ بات کہتے تھے جو حضرتِ عمر نے کہی تھی، جب اختلاف بڑھنے لگا تو رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا یہاں سے اُٹھ جاؤ۔ [1]

اس حدیث پر علماء نے بڑی تفصیل سے کلام کیا ہے جس میں ان مطاعن کا جواب دیا گیاہ جو شیعہ حضرات کی طرف سے عائد ہوتے ہیں مگر اس وقت ہمارے پیش نظر صرف منکرین سنت کا استدلال ہے جو انہوں نے حضرت عمر کے اس جملے (حسبنا کتاب اللہ) کو سامنے رکھ کر پیش کیا ہے جس کے بارے میں پرویز صاحب اپنی ایک تالیف میں بڑے فخریہ انداز میں لکھتے ہیں کہ:

---

[1] صحیح مسلم (کتاب الوصیۃ)، ج ۲: ص ۴۳۔

”یہی میری عمر بھر کی آرزو اور پکار ہے اور ان کے مظاہر کی تازہ کڑی میری یہ سعی و کاوش جو اس تصنیف کی شکل میں آپ کے سامنے ہے“۔ [1]

ہم اس بارے میں چند باتیں عرض کرنا چاہتے ہیں:

۱- حضرت عمر کے اسی ایک جملہ کو لے لینا اور ان کے عمر بھر کے ان اقوال و افعال سے یکدم آنکھیں بند کر لینا جس سے کتاب کے ساتھ سنت کی حجیت و اہمیت ثابت ہوتی ہے یقیناً انصاف سے بعید ہے جو ہستی عمر بھر سنت رسول کی حفاظت کرے اس کے مقابلے میں اپنے قیاس و اجتہاد کو ترک کر دے، اپنے ماتحت گورنروں اور قاضیوں کو بار بار ہدایت جاری کرے کہ وہ

---

[1] شاہکارِ رسالت، ص ۵۲۸۔

[2] اس مقام پر یہ حقیقت ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ جیسے متنِ حدیث سے ظاہر ہے، صحابہ اس مقدمے میں دو گروہ ہو گئے تھے اور حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما بھی اس وقت حاضر تھے، پس اگر یہ منع کرنے والوں میں تھے تو ان پر بھی وہی اعتراض ہوگا جو سیدنا فاروق اعظم ؓ پر کیا جاتا ہے اور اگر دوسرے گروہ میں تھے جو کاغذ وغیرہ کا لانا تجویز کرتے تھے تو بھی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رفع صوت کے مرتکب ہوئے نیز وہ کاغذات حاضر کرنے سے باز رہے، نہ اس وقت لائے نہ پھر کسی وقت، حالانکہ اس میں پوری امت کی خیر خواہی اور ضلالت سے حفاظت پائی جاتی تھی۔ ظاہر ہے اِئْتُوْنِیْ بِقِرْطَاسٍ (تم میرے پاس کاغذ لاؤ) کا خطاب بھی حاضرین کی طرف تھا نہ کہ خاص حضرت عمر ؓ کی طرف، پس اگر یہ امر فرضیت یا وجوب کے طور پر مانا جائے تو ہر ایک گناہگار اور مخالفِ فرمانِ شرع ہوا اور اگر یہ صیغہء امر وجوب کے لئے نہ ہو بلکہ امر ارشادی ہو یا امتحان و آزمائش کے طور پر ہو جیسا کہ بعض اکابر کا ذوق ہے تو اس صورت میں کوئی بھی مرتکب معصیت قرار نہیں پاتا اس لئے ماننا پڑے گا کہ فاروق اعظم ؓ کی بصیرت جلد ہی اس مسئلے کو سمجھ گئی کہ اس سے مراد تحریر لکھ دینا نہیں بلکہ اسوۂ حسنہ اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قول و فعل کی روشنی میں قرآن پاک کا مفصل سامانِ ہدایت ہونا ذہن نشین کرانا ہے، غرضیکہ یہ حدیث بصیرت فاروقی کی روشن دلیل ہے نہ کہ اُن پر موجب طعن، واللہ اعلم بالصواب۔

کتاب اللہ کے ساتھ سنت وحدیث کو بھی پیش نظر رکھیں اور اپنے فیصلوں کا ماٴخذ ٹھہرائیں اس سے یہ توقع کیونکر کی جاسکتی ہے کہ وہ کتاب اللہ کے ساتھ سنت کی حجیت کے قائل نہیں۔ آخر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک بزرگ صحابی کے صرف ایک جملے کو لے لیا جائے اور اسے اس کی پوری زندگی کے قول وعمل سے کاٹ کر الگ موقف ومسلک کا حامل قرار دیا جائے؟

۲- یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ حسبنا کتاب اللہ کہنے والے وہ فاروق اعظم ﷛ ہیں جنہوں نے تقریباً ۲۳ سال حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے قرآن کی تشریح وتفسیر سنی ہے اور رسولِ خدا ﷺ کی سیرت کی روشنی میں قرآن کی عملی تصویر آنکھوں سے دیکھی ہے اور ۱۲ سال تو سورۂ بقرہ کے علوم ومعارف سیکھنے پر صرف کر دیئے ہیں لہٰذا ان کا حسبنا کتاب اللہ کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس سنت اور پیغمبر اقدس ﷺ کے قول وفعل کی روشنی میں قرآن کو کافی سمجھ رہے ہیں نہ یہ کہ چند ڈکشنریاں یا اردو تراجم دیکھ کر حسبنا کتاب اللہ کا دعویٰ کر رہا ہے یہ جملہ حضرت عمر ﷛ کی زبان سے تو زیب دے سکتا ہے پرویز صاحب یا ہم لوگوں کو ایسا کہنے کا حق نہیں ہے۔

۳- اصل بات یہ ہے کہ صحابہ کے نزدیک لفظ کتاب اللہ کا ایک جامع اور عام مفہوم بھی تھا وہ جس طرح کتاب اللہ سے متن قرآنِ مجید مراد لیتے تھے اسی طرح کبھی لفظ کتاب اللہ بول کر متن وشرح دونوں کی طرف

اشارہ کر دیتے تھے خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعض ارشادات سے بھی اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے، حد زنا کے سلسلے میں دو آدمی پیش ہوئے اور انہوں نے یکے بعد دیگرے عرض کی اِقْضِ لِیْ بِکِتَابِ اللّٰہِ (ہمارا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق کیجئے) آپ نے ان سے سوال پوچھنے کے بعد فرمایا:

وَاللّٰہِ لَاَقْضِیَنَّ بَیْنَکُمَا بِکِتَابِ اللّٰہِ۔[1]

"بخدا میں تمہارا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق کروں گا"۔

اس کے بعد آپ نے فیصلہ فرمایا جس کا ایک جز یعنی سو کوڑوں کی سزا تو قرآنِ مجید میں مذکور ہے مگر سال کی جلاوطنی حدیثِ نبوی سے ثابت ہے جو متن قرآن سے زائد چیز ہے مگر اس پر بھی کتاب اللہ کا اطلاق کیا گیا ہے امام بخاری نے کتاب اخبار الآحاد کے علاوہ کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ میں بھی اس روایت کو اختصار سے ذکر کیا ہے۔ علامہ قسطلانی شارح بخاری وجہ مناسبت ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اِشَارَۃٌ اِلٰی اَنَّ السُّنَّۃَ یُطْلَقُ عَلَیْھَا کِتَابُ اللّٰہِ لِاَنَّھَا بِوَحْیِہٖ وَتَقْدِیْرِہٖ قَالَ تَعَالٰی وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی۔[2]

اس حدیث سے اشارہ ملتا ہے کہ سنت پر بھی کتاب اللہ کا اطلاق کیا جاتا ہے کیونکہ سنت بھی کتاب کی طرح وحی اور تقدیر الٰہی ہے جیسا کہ ارشاد

---

[1] صحیح بخاری، کتاب اخبار الآحاد، ج ۲: ص ۷۸۔ [2] قسطلانی شرح بخاری، ۱۰: ص ۳۰۲۔

خداوندی ہے وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوحٰى (اللہ کا نبی ہوائے نفس سے بات نہیں کرتا اس کی بات وحیِ الٰہی ہوتی ہے)۔

غرضیکہ حضرت عمر فاروق اعظم کا حسبنا کتاب اللہ کہنا انکار سنت کے طور پر نہیں بلکہ کتاب اللہ کے متن و شرح قرآن و حدیث دونوں کو اپنے لئے بنیاد دین تسلیم کرنے کے طور پر ہے اس سے منکرین حدیث کا استدلال بھی اسی طرح باطل ہے جس طرح شیعہ حضرات کا اسے حکم رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام سے انکار وانحراف کے لئے دلیل بنانا غلط ہے، حضرت عمر ؓ کی ذات ان تمام الزامات سے بری ہے وہ رسولِ خدا ﷺ کے سچے عاشق ہیں جن کے نزدیک محبوب ﷺ کے حکم کی اطاعت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔

مسئلہ طلاقِ ثلثہ میں فاروقی فیصلے کی اصل صورت

سنتِ نبوی میں ترمیم کو جائز ٹھہرانے والے دور فاروقی کے اس فیصلے کو بھی پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے ایک مجلس میں دی ہوئی تین طلاقوں کو طلاق مغلظہ قرار دیا حالانکہ اس سے پہلے تین طلاقوں کو ایک شمار کیا جاتا تھا حضرت عمر ؓ نے اس سنت میں ترمیم کر دی اور ائمہ فقہ نے اس ترمیم کو اجماعی طور پر قبول کر لیا لیکن اس معاملے میں بھی صحیح صورتِ حال یہ ہے کہ تین طلاقیں دورِ نبوی میں بھی تین ہی سمجھی جاتی تھیں چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

اِنَّ رَجُلاً طَلَّقَ اِمْرَاَتَہٗ ثَلاَثًا فَتَزَوَّجَتْ فَطَلَّقَ فَسُئِلَ النَّبِیُّ ﷺ اَتَحِلُّ لِلْاَوَّلِ قَالَ لَاحَتّٰی یَذُوْقَ عُسَیْلَتَھَا کَمَا ذَاقَ الْاَوَّلُ۔[1]

”ایک مرد نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں، اس عورت نے دوسری جگہ شادی کر لی، وہاں سے بھی طلاق ہو گئی، حضور ﷺ سے پوچھا گیا کہ وہ پہلے شوہر کیلئے حلال ہے؟ آپ نے کنایۃً وطی کو شرط قرار دیا“۔

رسولِ خدا علیہ الصلوٰۃ والسلام اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دور میں اتنی بات ضرور تھی کہ اگر کوئی شخص تین دفعہ طلاق کا الگ الگ تلفظ کر کے مثلاً یوں کہتا اَنْتِ طَالِقٌ طَالِقٌ طَالِقٌ اور پھر یہ کہتا کہ میری نیت ایک ہی طلاق کی تھی اور باقی دو مرتبہ میں نے محض تاکید کے طور پر یہ لفظ استعمال کیا ہے تو اس کے عذر کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام قبول فرما لیتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں جو کچھ کیا وہ یہ تھا کہ جب لوگ کثرت سے تین طلاقیں دیکر ایک طلاق کا عذر پیش کرنے لگے تو انہوں نے سوچا کہ اب طلاق کا معاملہ کھیل بنتا جا رہا ہے لہٰذا ہم اس عذر کو قبول نہیں کریں گے اور تین طلاقوں کو تین ہی کی حیثیت سے نافذ کریں گے اس کو تمام صحابہ نے بالاتفاق قبول کر لیا اور بعد میں تابعین، تبع تابعین اور ائمہ مجتہدین بھی اس پر متفق ہو گئے[2] ان میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ

---

[1] صحیح بخاری، ج ۲: ص ۹۱۔ [2] فتح القدیر، ج ۳: ص ۲۵، ۲۶۔ نصب الرایۃ، ج ۳: ص ۲۲۔

نے عہدِ رسالت کے قانون طلاق میں کوئی ترمیم کی ہے اس لئے کہ نیت کے عذر کو قبول کرنا قانون نہیں ہے بلکہ اس کا انحصار قاضی کی اس رائے پر ہے کہ جو شخص اپنی نیت بیان کر رہا ہے وہ صادق القول ہے یا نہیں؟ حضور ﷺ کے زمانے میں اکا دکا واقعہ پیش آیا، حضور علیہ السلام نے اسے قبول کر لیا، حضرت فاروقِ اعظم ؓ کے عہد میں جب سلطنتِ اسلامی کی حدود کافی پھیل گئیں اور اس قسم کے واقعات بکثرت پیش آنے لگے تو اس قسم کا عذر عدالتوں میں ناقابل تسلیم قرار پایا اسے سنتِ نبویہ میں ترمیم قرار دینا کہاں کی دانشمندی ہے؟

مؤلفۃ القلوب کا حصہ اور فاروقی طرزِ عمل

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضور رسولِ اکرم ﷺ کے زمانے میں مؤلفۃ القلوب کو صدقات کی مد سے امداد دی جاتی تھی حضرتِ عمر ؓ نے اپنے زمانے میں ختم کر دیا، معلوم ہوا کہ حضرت عمر حالات زمانہ کے مطابق سنت میں ترمیم کرنا مناسب سمجھتے تھے لیکن ہم کہتے ہیں کہ اگر حضرت عمر ؓ کے اس طرز عمل کو ترمیم و تنسیخ قرار دیا جائے تو پھر حدیث ہی کی نہیں قرآنِ مجید کی ترمیم لازم آئے گی اس لئے کہ مؤلفۃ القلوب کا ذکر تو خود قرآن مجید نے سورۂ توبہ میں کیا ہے۔

اصل بات صرف یہ ہے کہ حضور ؑ کے زمانے میں تالیفِ قلب کے لئے مال دینے کی ضرورت تھی اس لئے حضور ؑ اس مد سے لوگوں

کو دیا کرتے تھے، حضرت عمر ؓ نے مؤلفۃ القلوب کی مد سے لینے والے افراد سے فرمایا:

هٰذَا شَيْئٌ كَانَ يُعْطِيْكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ تَالِيْفاً لَكُمْ فَاَمَّا الْيَوْمَ فَقَدْ اَعَزَّ اللّٰهُ الْاِسْلَامَ وَاَغْنٰى عَنْكُمْ فَاِنْ ثَبَتُّمْ عَلَى الْاِسْلَامِ وَاِلَّا فَبَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ السَّيْفُ.[۱]

رسولِ اکرم ﷺ تمہیں تالیفِ قلب کے طور پر دیا کرتے تھے اب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ عطا فرمایا ہے اور ہمیں تم سے بے نیاز کر دیا ہے، تم اسلام پر ثابت قدم رہو تو بہتر ورنہ فیصلہ کرنے کے لئے تلوار موجود ہے۔

مشہور فقیہ علامہ کمال الدین ابن ہمام فرماتے ہیں:

عَدَمُ الدَّفْعِ الْاٰنَ لِلْمُؤَلَّفَةِ تَقْرِيْرٌ لِمَا كَانَ فِيْ زَمَنِهٖ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ لَا نَسْخٌ لِاَنَّ الْوَاجِبَ كَانَ الْاِعْزَازَ وَكَانَ بِالدَّفْعِ وَالْاٰنَ هُوَ فِيْ عَدَمِ الدَّفْعِ.[۲]

”اس وقت مؤلفۃ القلوب کو نہ دینے میں عہدِ رسالت کے کسی حکم کا نسخ لازم نہیں آتا بلکہ اس کی تقریر و پختگی پائی جاتی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اس وقت مال دینے سے اعزازِ اسلام مقصود تھا اور اب مال نہ دینے میں اعزاز و شوکت اسلام کا اظہار ہے، غرضیکہ اسے کسی طرح سنت نبوی یا حکم قرآنی کی ترمیم و تنسیخ قرار نہیں دیا جا سکتا“۔

---

[۱] عنایہ شرح ہدایہ برحاشیہ فتح القدیر، ج ۲: ص ۱۴۔ [۲] فتح القدیر، ۲: ص ۱۵۔ روح المعانی، ۱۰: ص ۱۲۲۔

مفتوحہ اراضی کے متعلق فیصلہء فاروقی اور سنتِ رسول ﷺ

سیرتِ فاروقی کے بارے میں یہ اشکال بھی کیا جا سکتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے میں مفتوحہ اراضی مجاہدین میں تقسیم کر دی گئی لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فیصلہ بدل دیا اور ارضِ عراق کی مفتوحۃ اراضی اصل مالکوں کے پاس رہنے دی گئی، یہ اشکال اس صورت میں صحیح ہو سکتا تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مفتوحہ اراضی کے بارے میں ایک مخصوص فیصلہ فرما دیا ہوتا کہ وہ بہر صورت مجاہدین کو ملے گی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کے خلاف کرتے تو یقیناً اسے سنت میں تبدیلی قرار دیا جاتا یا یہ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو اراضی مجاہدین میں تقسیم کر دی تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہ اراضی واپس لے کر کوئی اور فیصلہ صادر کرتے تو اسے تبدیلی سنت کا نام دیا جاتا لیکن ایسا نہیں ہوا حقیقت یہ ہے کہ مختلف حالات ومقتضیات کے تحت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فدک، بنی قریظہ، بنی نضیر اور اہل خیبر کی مفتوحہ اراضی کے بارے میں مختلف فیصلے فرمائے تھے، کسی ایک طریق کار کو معین نہیں فرمایا تھا کہ اب اس میں کمی بیشی سے سنت رسول ﷺ کی مخالفت لازم آتی اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سوادِ عراق کے بارے میں یہ طرز عمل اختیار کیا کہ اسے سابقہ مالکوں کے پاس رہنے دیا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی ان کے موقف کی تائید کی، حضرت بلال رضی اللہ عنہ وغیرہ

نے ابتداً میں مخالفت کی مگر بعد میں سب نے حضرت عمرؓ کے دلائل سے اتفاق کرلیا، غرضیکہ حضرت عمرؓ نے صحابہ کرام کے مشورے سے اراضی مفتوحہ کا جو بندوبست کیا، اسے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فیصلوں میں ردوبدل کی مثال کے طور پر پیش کرنا درست ہی نہیں ہے۔

مشہور فقیہ علامہ سرخسی اس مسئلہ کو ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَكَذٰلِكَ مَايُرْوٰى اَنَّ عُمَرَؓ حِيْنَ فَتَحَ السَّوَادَ مَنَّ بِهَا عَلٰى اَهْلِهَا وَاَبٰى اَنْ يُّقَسِّمَهَا بَيْنَ الْغَانِمِيْنَ عَلٰى اَنَّهٗ ذٰلِكَ لَمْ يَكُنْ حُكْمًا حَتْمًا مِنْ وَجْهٍ لَايَجُوْزُ غَيْرُهٗ فِي الْغَنَائِمِ۔[1]

”حضرت عمرؓ کے بارے میں روایت ہے کہ انہوں نے سواد عراق کی اراضی کو بطور احسان وہاں کے باشندوں کے پاس رہنے دیا اور مجاہدین میں تقسیم کرنے سے انکار کردیا کیونکہ آپ جانتے تھے کہ اس بارے میں کوئی قطعی حتمی حکم موجود نہیں“۔

غرضیکہ حضرت عمرؓ اتباع سنت کا پیکر تھے ان کی طرف سنت میں تبدیلی یا ترمیم کی نسبت کرنا بہت بڑا تاریخی جھوٹ ہے جو کسی دیندار اہل علم سے سرزد نہیں ہوسکتا۔

حضرت عثمان غنیؓ اور اتباع سنت

اب حضرت عثمان غنیؓ کے دور پر نظر ڈالئے، اس میں بھی آپ

---

[1] اصول سرخسی، ج ۲: ص ۸۔

اتباعِ سنت کو اتباعِ قرآن کے ساتھ ساتھ محسوس کریں گے۔ سب سے پہلے جب آپ کی بیعت کی جاتی ہے تو اس میں یہ الفاظ کہے جاتے ہیں:

نُبَایِعُکَ عَلٰی سُنَّةِ اللّٰہِ وَسُنَّةِ رَسُوْلِہٖ وَسُنَّةِ الْخَلِیْفَتَیْنِ بَعْدَہٗ۔[1]

''ہم آپ کی بیعت کرتے ہیں، قانونِ خداوندی، سنتِ نبوی اور شیخین کے طریق کار کی پیروی کرنے پر''۔

حضرت عثمان غنی ؓ منتخب ہونے کے بعد جو خطبہ دیتے ہیں، اس میں بھی سنت کے تشریعی مقام کو یوں واضح کرتے ہیں:

اَمَّا بَعْدُ فَاِنِّیْ قَدْ حُمِلْتُ وَقَدْ قَبِلْتُ اَلَا وَاِنِّیْ مُتَّبِعٌ وَلَسْتُ بِمُبْتَدِعٍ اَلَا وَاِنَّ لَکُمْ عَلَیَّ بَعْدَ کِتَابِ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ وَسُنَّةِ نَبِیِّہٖ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثَلَاثًا الخ۔[2]

''حمد و صلوٰۃ کے بعد (میں کہتا ہوں کہ) مجھ پر خلافت کا بار ڈال دیا گیا ہے اور میں نے اسے قبول کرلیا ہے، یاد رہے میں پیروی کرنے والا ہوں، نئی راہ نکالنے والا نہیں، مجھ پر کتاب اللہ اور سنتِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پابندی کے بعد تمہارے تین حق ہیں''۔

پھر ان کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

''ایک یہ کہ میرے پیشرو خلفاء کے زمانے میں اتفاق و اجماع سے جو فیصلے طے ہو چکے ہیں، ان کی پابندی کرونگا، دوسرے یہ کہ جو امور اب اہل

---

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۱۱۹۔ [2] تاریخ ابن جریر، ج ۵: ص ۱۴۹۔

خیر کے اتفاق واجماع سے طے ہوں گے ان پر عملدرآمد کروں گا، تیسرے یہ کہ تم پر دست درازی کرنے سے باز رہونگا تاوقتیکہ تم ازروئے قانون مواخذہ کے مستحق نہ بن جاؤ"۔

اس تاریخی خطبے میں آپ نے دستور کے بنیادی اصولوں کی طرف اشارہ کر دیا کتاب اللہ کے ساتھ سنتِ رسول کی اہمیت کا اعلان کیا اور پھر اجماع کی اہمیت کو بیان کیا۔

آپ نے اپنے دورِ خلافت میں ہمیشہ سنتِ نبوی سے تمسک کیا اور ارشاداتِ نبویہ کو بطور دلیل پیش کیا۔ کچھ لوگوں نے اعتراض کیا کہ آپ نے اقربا پروری سے کام لیا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے قومی امانت میں سے اپنے اقربا پر کوئی ناجائز خرچ نہیں کیا، آپ خود صاحب دولت تاجر تھے، اپنی خداداد دولت میں سے اقربا پر خرچ کرتے تھے اور حکم خداوندی کی تعمیل کرتے تھے کہ اہل قرابت سے اچھا سلوک کرنا چاہیے نیز آپ کے سامنے ارشادِ نبوی تھا کہ اہل قرابت پر خرچ کرنا دوگنے اجر کا باعث ہے، ایک صدقے کا اجر اور دوسرا صلہ رحمی کا۔

حضرت عثمان غنی ؓ روایت حدیث میں محتاط تھے لیکن جونہی حضور علیہ، صلوٰۃ والسلام کی کوئی حدیث پہنچ جاتی، اس پر ضرور عمل فرماتے۔ مسند احمد میں اس سلسلے میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک دفعہ حج کے موقع پر آپ

احرام باندھ کر جا رہے تھے، بہت سے مسلمان آپ کے ساتھ تھے، جب آپ مقامِ قُدَید پہنچے تو وہاں کے لوگوں نے شکار کر کے تلے ہوئے چکور پیش کیے چنانچہ وہ دستر خوان پر چن دیے گئے۔ ایک راوی کا بیان ہے:

کَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلَی الْحَجَلِ حَوَالِی الْجِفَانِ.

"گویا اب بھی تلے ہوئے چکور طشت میں نظر آ رہے ہیں"۔

اتنے میں پتا چلا کہ اسی قافلے میں حضرت علی بن ابی طالب ؓ بھی آ رہے ہیں اور وہ ان شکار کردہ چکوروں کے کھانے سے منع کر رہے ہیں، حضرت عثمان ؓ نے حضرت علی ؓ کو بلا کر کہا:

"نہ ہی ہم نے شکار کیا ہے، نہ ہی اس کا حکم دیا ہے، یہ ان لوگوں نے شکار کیا ہے جو حالتِ احرام میں نہ تھے، اب اس کے کھانے میں کیا مضائقہ ہے؟"۔

حضرت علی ؓ نے جواب دیا:

"آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بحالتِ احرام گورخر کی ران پیش کی گئی، آپ نے فرمایا تھا ہم لوگ احرام کی حالت میں ہیں، چاہیے کہ یہ گوشت انہیں کھلایا جائے جو احرام سے نہ ہوں"۔ [1]

چنانچہ اپنے آقا و مولیٰ کی حدیث سن کر آپ نے کھانے کا ارادہ ترک کر دیا اور وہ تلے ہوئے چکور چشمے پر مقیم لوگوں کے کام آئے۔

---

[1] مسند امام احمد، ج ۱: ص ۱۲۷۔

امام شافعی نے ''الرسالہ'' میں سندِ صحیح کے ساتھ فریعہ بنت مالک کا واقعہ نقل کیا ہے۔ اس کا شوہر قتل ہو گیا، اس نے شوہر کے گھر سے دورانِ عدت منتقل ہونے کی اجازت چاہی، رسولِ اکرم ﷺ نے اوّلاً رخصت دے دی مگر پھر بلا کر فرمایا کہ عدت ختم ہونے تک اپنے شوہر کے مکان میں رہو، حضرت عثمان غنی ؓ کو فریعہ بنت مالک نے یہ روایت پیش کی تو انہوں نے قیاس کو ترک کر کے اسے قبول کرلیا، امام شافعی لکھتے ہیں:

وَعُثْمَانُ فِیْ اِمَامَتِہٖ وَعِلْمِہٖ یَقْضِیْ بِخَبَرِ اِمْرَأَۃٍ بَیْنَ الْمُهَاجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ۔ [1]

''حضرت عثمان ؓ اپنی امامت اور جلالتِ علمی کے باوجود مہاجرین وانصار کے جمِ غفیر میں ہوتے ہوئے ایک عورت کی روایت کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں''۔ (یہ ان کے جذبہ اتباعِ سنت کی روشن دلیل ہے)

جب حضرت عثمان غنی ؓ کا محاصرہ کیا گیا تو آپ نے اتمام حجت کے طور پر ارادۂ قتل کرنے والوں کے سامنے جو تقریر کی، اس میں بھی حدیث رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا:

سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ لَایَحِلُّ دَمُ امْرَأٍ مُّسْلِمٍ اِلَّا بِاِحْدٰی ثَلَاثٍ رَجُلٌ کَفَرَ بَعْدَ اِسْلَامِہٖ اَوْزَنٰی بَعْدَ اِحْصَانِہٖ اَوْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَیْرِ نَفْسٍ فَوَاللّٰہِ مَازَنَیْتُ فِیْ جَاهِلِیَّۃٍ وَلَا اِسْلَامٍ

---

[1] الرسالہ (للشافعی) ص ۴۳۹۔

وَلَا تَمَنَّیْتُ اَنَّ لِیْ بِدِیْنِیْ بَدَلاً مُنْذُ هَدَانِیَ اللّٰهُ وَلَا قَتَلْتُ نَفْساً فَلِمَ تَقْتُلُوْنَنِیْ۔[1]

''میں نے رسولِ اکرم ﷺ سے سنا ہے کہ مسلمان کا خون تین صورتوں کے سوا بہانا درست نہیں، اسلام لانے کے بعد کفر کرے، شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کرے، کسی کو ناحق قتل کرے۔ خدا کی قسم میں نے تو نہ جاہلیت میں بدکاری کی ہے نہ اسلام میں، نہ ہی کبھی میرے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ اسلام کے بدلے میں کوئی اور دین اختیار کروں اور نہ ہی میں نے کبھی کسی کو قتل کیا پس تم مجھے کیوں قتل کرتے ہو؟''۔

دورانِ محاصرہ نہ تو آپ لڑائی پر آمادہ ہوئے اور نہ ہی باغیوں کے مطالبے پر خلافت سے دستبردار ہونا قبول کیا، اس کی وجہ بھی درحقیقت اتباعِ حدیث تھی، آپ اقتدار کے شائق نہ تھے مگر آپ نے ارشادِ نبوی کی تعمیل میں خلافت چھوڑنا پسند نہیں کیا، صاحب اسد الغابہ نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے:

اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ یَا عُثْمَانُ اِنَّهٗ لَعَلَّ اللّٰهَ یُقَمِّصُکَ قَمِیْصًا فَاِنْ اَرَادُوْکَ عَلٰی خَلْعِهٖ فَلَا تَخْلَعْهُ لَهُمْ.[2]

''رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا اے عثمان! اللہ تجھے ایک قمیض پہنائے گا لوگ اتارنا چاہیں تو وہ قمیض (خلافت) اتار کر نہ دینا''۔

---

[1] سنن نسائی، ج ۲: ص ۱۳۶۔ [2] اسد الغابہ فی معرفۃ احوال الصحابۃ، ج ۳: ص ۳۸۳۔

جب آپ سے کہا گیا کہ باغیوں سے قتال کریں تو آپ نے جواب دیا:

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَهِدَ اِلَىَّ عَهْدًا وَاَنَا صَابِرٌ نَفْسِىْ عَلَيْهِ۔[1]

"رسولِ اکرم ﷺ نے مجھ سے ایک عہد لیا ہے، میں اسی پر صبر کئے بیٹھا ہوں"۔

یہ اس پیکرِ اتباع کا جذبہ تسلیم و رضا تھا کہ ارشادِ نبوی کی تعمیل میں اپنی جان دے دی مگر کسی سے قتال کرنا پسند نہیں کیا۔ (رضی اللہ عنہ وارضاہ)

ان لوگوں کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ سنن نبویہ کو بدل دیا کرتے تھے حقائق سے بغاوت نہیں تو اور کیا ہے؟۔

مولا علی ؓ کا اہل مصر کے نام پیغام

اب آیئے حضرت مولا علی ؓ کے دور پر ہلکی سی نظر ڈالیں، یہاں پر سیرتِ مرتضوی کا تفصیلی جائزہ تو پیش نہیں کیا جاسکتا، عہد مرتضوی کی چند جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں جن سے سنت کی اہمیت ثابت ہوتی ہے:

۱۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب قیس بن سعد بن عبادہ کو مصر کا گورنر بنا کر بھیجا تو اپنا پیغام دیتے ہوئے فرمایا کہ اے اہل مصر

---

[1] الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، ج۳: ص ۱۰۴۳۔

کے مجمع میں پڑھ کر سنا دینا، اس پیغام میں حمد و ثنا کے بعد بعثتِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مقاصد کا ذکر تھا اور پھر شیخین کے فضائل و مناقب کا بیان تھا، چنانچہ فرمایا:

ثُمَّ اِنَّ الْمُؤْمِنِيْنَ اسْتَخْلَفُوْا بِهٖ اَمِيْرَيْنَ صَالِحَيْنِ عَمِلاً بِالْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ وَاَحْسَنَا السِّيْرَةَ وَلَمْ يَعْدُوَا السُّنَّةَ. [1]

”پھر مسلمانوں نے حضور ﷺ کے بعد یکے بعد دیگرے دو امیر مقرر کیے جو صالح تھے، کتاب و سنت کے عامل تھے، ان کی سیرت نہایت عمدہ تھی، انہوں نے سنتِ نبویہ سے تجاوز نہ کیا“۔

اس میں جہاں شیخین کی فضیلت کا بیان ہے وہاں سنت کی اہمیت کا پتا بھی چلتا ہے کہ کتاب اللہ کے ساتھ اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہے اور کسی کے کمال کا معیار یہ ہے کہ وہ سنتِ نبویہ سے سرمو انحراف نہ کرے اس کے بعد اپنی بیعت اور سربراہِ مملکت کی ذمہ داریوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

اَلاَ وَاِنَّ لَكُمْ عَلَيْنَا الْعَمَلَ بِكِتَابِ اللّٰهِ وَسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْقِيَامَ عَلَيْكُمْ بِحَقِّهٖ وَالتَّنْفِيْذَ لِسُنَّتِهٖ وَالنُّصْحَ لَكُمْ بِالْغَيْبِ. [2]

”ہمارے اوپر بحیثیت سربراہ مملکت یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اکرم ﷺ پر عمل پیرا ہوں احکام کتاب اللہ کو قائم رکھنا،

---

[1] تاریخ طبری، ج ۵، ص ۲۷۷۔ [2] تاریخ طبری، ج ۵، ص ۲۷۷۔ شرح نہج البلاغۃ (ابن ابی الحدید) ۶: ۲۳۔

سنتِ نبویہ کو نافذ کرنا اور پیٹھ پیچھے سب کی خیر خواہی کرنا بھی ہمارا فرض ہے"۔

۲- اس کے بعد آپ اس تاریخی معاہدہ پر غور کریں جو حضرت سیدنا علی ؓ اور حضرت معاویہ ؓ کے درمیان طے پایا تھا اس میں بھی تمام متنازعہ امور کے تصفیہ کیلئے کتاب وسنت کی طرف رجوع کرنے کا عہد موجود ہے، وہ معاہدہ یہ ہے:

هٰذَا مَا تَقَاضٰی عَلَیْهِ عَلِیُّ ابْنُ اَبِیْ طَالِبٍ وَمُعَاوِیَةُ بْنُ اَبِیْ سُفْیَانَ قَاضٰی عَلِیٌّ عَلٰی اَهْلِ الْکُوْفَةِ وَمَنْ مَعَهُمْ مِنْ شِیْعَتِهِمْ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُسْلِمِیْنَ اِنَّمَا نَنْزِلُ عِنْدَ حُکْمِ اللّٰهِ عزوجل وَکِتَابِهٖ وَلَایَجْمَعُ بَیْنَنَا غَیْرُهٗ وَاِنَّ کِتَابَ اللّٰهِ عزوجل بَیْنَنَا مِنْ فَاتِحَتِهٖ اِلٰی خَاتِمَتِهٖ نُحْیِیْ مَا اَحْیَا وَنُمِیْتُ مَا اَمَاتَ فَمَا وَجَدَ الْحَکَمَانِ فِیْ کِتَابِ اللّٰهِ عزوجل وَهُمَا اَبُوْمُوْسَی الْاَشْعَرِیُّ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ قَیْسٍ وَعَمْرُو بْنُ الْعَاصِ عَمِلَا بِهٖ وَمَا لَمْ یَجِدَا فِیْ کِتَابِ اللّٰهِ عزوجل فَالسُّنَّةُ الْعَادِلَةُ الْجَامِعَةُ غَیْرُ الْمُفَرِّقَةِ۔[1]

یہ وہ معاہدہ ہے جس پر حضرت علی ؓ اہل کوفہ و دیگر متبعین کی طرف سے اور حضرت معاویہ ؓ اہل شام و دیگر معاونین کی طرف سے متفقہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ہم کتاب اللہ کے حکم کو تسلیم کرتے ہیں، اس کے سوا دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جمع نہیں کرسکتی اللہ کی کتاب شروع سے آخر تک ہمارے پاس

---

[1] تاریخ طبری، ج ۶، ص ۲۹، ۳۰۔ البدایہ والنہایہ، ج ۷، ص ۲۷۶۔ تاریخ ابن خلدون، ج ۲، ص ۱۱۱۱۔

موجود ہے ہم اسی امر کا احیاء کریں گے جس کا کتاب اللہ نے احیاء کیا اور اسی چیز کو فنا کریں گے جسے کتاب اللہ نے مٹا دیا، ہمارے دونوں حکموں ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کریں اور کتاب اللہ میں مسئلے کا حل نہ ملے تو پھر سنت کی طرف رجوع کریں جو عدل وانصاف پر مبنی ہے اور تفریق کو ختم کر کے وحدت کو قائم رکھنے والی ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلامی آئین ودستور سازی کیلئے کتاب اللہ کافی ہے سنت کی ضرورت نہیں، انہیں چاہیے کہ وہ خلفاءِ راشدین کی ان تاریخی تحریروں کا جائزہ لیں، یہ حضرات ہم سب سے زیادہ کتاب اللہ کو سمجھنے والے تھے لیکن کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ سنتِ رسول کا ذکر بھی فرماتے ان کے نزدیک سنت، وحدتِ امت کو برقرار رکھنے والی چیز ہے نہ کہ موجب تفرقہ وانتشار۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جس طرح رسالت پر ایمان کے بغیر محض توحید کو تسلیم کرنے سے ایمان حاصل نہیں ہوسکتا اسی طرح سنتِ رسول اللہ ﷺ کو تسلیم کئے بغیر صرف کتاب سے ہدایت حاصل نہیں ہوسکتی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور روایتِ حدیث میں احتیاط

حضرت علی بن ابی طالب کے دل میں حدیثِ رسول علیہ السلام کا

انتہائی احترام تھا آپ فرمایا کرتے تھے:

لَاَنْ اَخِرَّ مِنَ السَّمَآءِ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَنْ اَکْذِبَ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ [۱]

”میرے لئے آسمان سے زمین پر گر جانا زیادہ محبوب ہے بجائے اس کے کہ رسول اکرم ﷺ کیطرف غلط بات منسوب کروں“۔

آپ دوسروں سے روایت لینے میں بھی بہت احتیاط فرماتے تھے چنانچہ آپ ارشاد فرماتے ہیں:

کُنْتُ اِذَا سَمِعْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَدِیْثًا نَفَعَنِیَ اللّٰہُ بِمَا شَآءَ اَنْ یَنْفَعَنِیْ مِنْہُ وَکَانَ اِذَا حَدَّثَنِیْ غَیْرُہٗ اسْتَحْلَفْتُہٗ فَاِذَا حَلَفَ صَدَّقْتُہٗ. [۲]

”میں خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے حدیث سنتا تو اس سے توفیق ایزدی کے مطابق نفع حاصل کرتا اگر کوئی دوسرا مجھ سے روایت کرتا تو میں اس سے حلف اٹھواتا، اگر وہ حلف اٹھا دیتا تو میں اسے سچا قرار دیتا“۔

حضرت علی ابن ابی طالب نے روایات موضوعہ کے فتنے کو روکنے کے لئے کیسا عمدہ اصول مقرر کیا، علامہ ذہبی نے اس اصول کو نقل کیا ہے:

حَدِّثُوا النَّاسَ بِمَا یَعْرِفُوْنَ وَدَعُوْا مَا یُنْکِرُوْنَ. [۳]

”لوگوں کے سامنے وہ روایتیں بیان کرو جنہیں وہ معروف جانتے

---

[۱] مسند امام احمد، ج ۱: ص ۱۵۷۔ [۲] تذکرۃ الحفاظ، ج ۱: ص ۹ [۳] ایضاً، ج ۱: ص ۱۲۔

ہوں اور وہ روایات بیان نہ کرو جن کو وہ منکر جانتے ہوں"۔

اس اصول کو سامنے رکھ کر حضرات محدثین نے معروف و منکر کی اصطلاحات قائم کی تھیں۔

حضرت علی اور تمسک بالسنۃ

حضرت علی بن ابی طالب ﷺ کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ سنت رسول ﷺ سے بھی استدلال پیش کیا کرتے تھے چنانچہ جب خوارج نے آپ پر اعتراض کیا کہ آپ نے حضرت امیر معاویہ کے ساتھ نزاعی معاملات کو طے کرنے کے لئے تحکیم (حکم بنانا) کیوں قبول کی تو آپ نے جواباً قرآن و سنت دونوں سے دلیل پیش کی، آپ نے فرمایا کہ قرآن میں حکم ہے اگر خاوند و بیوی میں اختلاف پیدا ہو جائے تو دونوں کے اہل قرابت میں سے دو حکم بنائے جائیں جو مصالحت کرائیں جب اس قدر محدود گھریلو معاملے کیلئے تحکیم جائز ہے تو مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کے اختلافات کو ختم کرنے کے لئے تحکیم کیوں جائز نہیں؟۔

آپ نے اسی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ سنت سے بھی دلیل پیش کی، آپ نے فرمایا رسول پاک ﷺ کی ذات ہمارے لئے اسوۂ حسنہ ہے، آپ نے تو کفار سے بھی حدیبیہ کے مقام پر صلح کر لی تھی، اگر میں نے مسلمانوں

---

[1] مسند امام احمد، ج ۱: ص ۱۱۵۔ البدایہ والنہایہ، ج ۷: ص ۲۸۰۔

سے صلح کر لی ہے تو اسمیں کیا مضائقہ ہے؟[1]

برصغیر کے عظیم محدث شاہ عبدالعزیز دہلوی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ جب حضرت علی ﷺ نے حضرت ابن عباس کو خوارج کے ساتھ مناظرہ کرنے کے لئے بھیجا تو انہیں تاکید فرمائی:

عَلَیْکَ بِالسُّنَّةِ فَاِنَّ الْقُرْاٰنَ ذُوْوُجُوْہٍ۔[1]

"سنت کو لازم پکڑنا اس لئے کہ قرآن تو کئی وجوہ کا محتمل ہے"۔ (ان وجوہِ محتملہ میں سے معنٰی مرادی کی تعیین سنت ہی سے ہو سکتی ہے)

غرضیکہ حضرات خلفاءِ راشدین نے کتاب کے ساتھ سنت کو شرعی اور آئینی حجت قرار دیا اور چھوٹے مسائل سے لے کر اہم ملکی معاملات تک سب میں کتاب کے ساتھ ساتھ سنت سے بھی تمسک کیا ہے۔

اقسامِ سنت اور ان کا شرعی مقام

منکرین سنت احادیث کی اہمیت گھٹانے کیلئے کہہ دیتے ہیں کہ روایت کی صرف ایک قسم (متواتر) ہی یقینی ہو سکتی تھی اور چونکہ ایسی کوئی حدیث نہیں بلکہ ساری اخبارِ آحاد ہیں جو صرف ظن کا فائدہ دیتی ہیں اس لئے احادیث وسنن کے تمام ذخائر ناقابل اعتماد ہیں۔ ہم انشاء اللہ آنے والی بحث میں علمائے اصول کی تحقیقات کی روشنی میں سنت کے مختلف اقسام اور

---

[1] تفسیر فتح العزیز، ج ۱: ص ۸۶۔

ان کا شرعی مقام بیان کریں گے اور اس بارے میں منکرین حدیث کے شبہات کا علمی جواب بھی تحریر کریں گے۔

سنت کی تقسیم

سنتِ مسند (جس کی پوری سند بیان کی گئی ہو) کی تین قسمیں ہیں، خبر متواتر، خبر مشہور، خبر واحد۔

خبر متواتر

علمائے اصول نے خبر متواتر کی یہ تعریف کی ہے:

مَایَکُوْنُ رُوَاتُہٗ فِیْ کُلِّ عَھْدٍ قَوْمًا لَایُحْصٰی عَدَدُھُمْ وَلَا یُمْکِنُ تَوَاطُؤُھُمْ عَلَی الْکِذْبِ لِکَثْرَتِھِمْ وَعَدَالَتِھِمْ وَتَبَایُنِ اَمَاکِنِھِمْ۔[1]

"ہر وہ حدیث متواتر ہے جس کو ہر زمانے میں ایسی قوم نے روایت کیا ہو کہ جن کا جھوٹ پر متفق ہونا، ان کی کثرتِ تعداد اور امانت وعدالت اور ان کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے کے باعث ناممکن ہو"۔

یہ بدیہی امر ہے کہ جس روایت کو بیان کرنے والے ایسے بے شمار پاکباز افراد ہوں جن کی صداقت وعدالت مسلم ہو تو ایسی روایت یقیناً علم یقینی کا فائدہ دے گی اور کوئی ذی ہوش آدمی اس کی قطعیت سے انکار نہیں کرے گا۔

علامہ فخر الاسلام بزدوی (م ۴۸۲ھ) فرماتے ہیں:

---

[1] توضیح، ج ۲: ص ۲۲۳۔ الحسامی (بحث السنۃ)، ص ۶۷۔ اصول بزدوی، ص ۱۵۰۔

وَهٰذَا الْقِسْمُ يُوْجِبُ عِلْمَ الْيَقِيْنِ بِمَنْزِلَةِ الْعَيَانِ عِلْمًا ضَرُوْرِيًّا۔[۱] "خبر متواتر علم یقینی کا فائدہ دیتی ہے اس سے ایسا علم بدیہی حاصل ہوتا ہے جو بمنزلہ چشم دید ہو"۔

خبر متواتر کا وجود

یہ کہنا قطعاً درست نہیں کہ خبر متواتر کا سرے سے وجود ہی نہیں اہل نظر بخوبی جانتے ہیں کہ حدیث میں اس کا بہت بڑا ذخیرہ پایا جاتا ہے چنانچہ پانچ نمازوں کی فرضیت، تعداد رکعات، شرحِ زکوٰۃ اور اس قسم کے بہت سے امور ہیں جو تواتر سے ثابت ہیں۔ [۲]

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ شروطِ تواتر کی حامل حدیث نہیں ملتی انہوں نے تدبر سے کام نہیں لیا احادیث کی تمام مشہور کتابیں جن کے متعلق ہمیں پورا وثوق ہے کہ ان کی نسبت ان کے مصنفین کی طرف یقینی ہے جب ان میں متفقہ طور پر ایک حدیث مرقوم ہو اور ہر ایک کا سلسلہ سند بھی جدا ہو تو ایسی حدیث بلاشبہ علم یقینی کا فائدہ دے گی کیونکہ تمام ائمہ حدیث کا ایک جھوٹی روایت پر متفق ہونا قطعاً محال ہے ایسی احادیث کتب حدیث میں بکثرت موجود ہیں، چنانچہ مشہور محدث حافظ ابن حجر عسقلانی شرح نخبۃ الفکر میں لکھتے ہیں:

---

[۱] اصول بزدوی، ص ۱۵۰۔

[۲] الحسامی، ص ۶۷۔

وَمِنْ اَحْسَنِ مَا یُقَرَّرُ بِهٖ کَوْنُ الْمُتَوَاتِرِ مَوْجُوْدًا وُجُوْدَ کَثْرَةٍ فِی الْاَحَادِیْثِ اَنَّ الْکُتُبَ الْمَشْهُوْرَةَ الْمُتَدَاوَلَةَ بِاَیْدِی اَهْلِ الْعِلْمِ شَرْقًا وَّغَرْبًا اَلْمَقْطُوْعَ عِنْدَهُمْ بِصِحَّةِ نِسْبَتِهَا اِلٰی مُصَنِّفِیْهَا اِذَا اجْتَمَعَتْ عَلٰی اِخْرَاجِ حَدِیْثٍ وَتَعَدَّدَتْ طُرُقُهٗ تَعَدُّدًا تَحِیْلُ الْعَادَةُ تَوَاطُؤَهُمْ عَلَی الْکِذْبِ اِلٰی اٰخِرِ الشُّرُوْطِ اَفَادَ الْعِلْمَ الْیَقِیْنِیَّ لِصِحَّتِهٖ اِلٰی قَائِلِهٖ وَمِثْلُ ذٰلِکَ فِی الْکُتُبِ الْمَشْهُوْرَةِ کَثِیْرٌ۔[1]

”حدیث متواتر کے کثرت کے ساتھ موجود ہونے کی عمدہ تقریر یہ ہے کہ وہ کتب مشہورہ جو شرقاً غرباً اہل علم کے ہاتھوں میں موجود ہیں اور جن کی نسبت ان کے مصنفین کی طرف بالکل قطعی ہے جب ان کتابوں میں ایک روایت مختلف طرق و اسانید کے ساتھ مروی ہو تو عادۃً ان محدثین کا جھوٹ پر اتفاق محال سمجھا جائے گا اور شروطِ تواتر کے پائے جانے کی بنا پر اس سے علم یقینی حاصل ہوگا کتب مشہورہ میں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں“۔

تواتر کے اقسام

نفس تواتر کی چار قسمیں ہیں:

۱- تواتر اسناد

---

[1] شرح نخبۃ الفکر، ص ۲۳۔

۲-تواتر طبقہ

۳-تواتر تعامل

۴-تواتر معنوی

۱-تواتر اسناد کا وہی مفہوم ہے جو خبر متواتر کی تعریف میں بیان ہو چکا ہے یعنی وہ حدیث جس کو اول سند سے آخر سند تک اتنی بڑی جماعت نے روایت کیا ہو جن کا جھوٹ پر متفق ہونا محال ہو اس کی مثال دیتے ہوئے حافظ ابن صلاح لکھتے ہیں:

حَدِيْثُ مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ نَرَاهُ مِثَالًا لِذٰلِكَ فَإِنَّهُ نَقَلَهُ مِنَ الصَّحَابَةِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمُ الْعَدَدُ الْجَمُّ وَهُوَ فِي الصَّحِيْحَيْنِ مَرْوِيٌّ عَنْ جَمَاعَةٍ مِّنْهُمْ وَذَكَرَ اَبُوْ بَكْرِ الْبَزَّارُ الْحَافِظُ الْجَلِيْلُ فِيْ سَنَدِهٖ اَنَّهُ رَوَاهُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَحْوٌ مِنْ اَرْبَعِيْنَ رَجُلًا مِنَ الصَّحَابَةِ وَذَكَرَ بَعْضُ الْحُفَّاظِ اَنَّهُ رَوَاهُ عَنْهُ اِثْنَانِ سِتُّوْنَ نَفْسًا مِنَ الصَّحَابَةِ وَفِيْهِمُ الْعَشَرَةُ الْمَشْهُوْدُ لَهُمْ بِالْجَنَّةِ۔[1]

"یہ حدیث کہ جس نے مجھ پر عمداً جھوٹ بولا اس نے اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالیا" متواتر کی مثال بن سکتی ہے اسے صحابہ سے تعدادِ کثیر نے روایت کیا ہے اور صحیحین میں بھی ایک جماعت سے مروی ہے، ابوبکر بزار جو بڑے

---

[1] مقدمہ ابن صلاح، ص ۲۴۳۔

جلیل القدر حافظ الحدیث ہیں، اپنے مسند میں ذکر کرتے ہیں کہ اسے رسولِ اکرم ﷺ سے تقریباً چالیس صحابہ نے روایت کیا ہے بعض حفاظ نے باسٹھ صحابہ کا نام لیا ہے جن میں عشرہ مبشرہ بھی داخل ہیں"۔

علامہ محی الدین نووی نے شرح مسلم میں لکھا ہے:

قَالَ بَعْضُهُمْ رَوَاهُ مِأَتَانِ مِنَ الصَّحَابَةِ.[1]

"بعض صحابہ کا قول ہے کہ اسے تقریباً دوسو صحابہ نے روایت کیا ہے"۔

۲-تواتر طبقہ جسے عہدِ رسالت سے اب تک طبقۃً بعد طبقۃٍ تواتر حاصل ہو، صرف ایک خاص سلسلۂ سند اصطلاحی انداز میں نہ ہو بلکہ شرقاً غرباً اس کی شہرت اور تواتر ثابت ہو جیسا کہ قرآنِ پاک کا تواتر ہے، اسے مسلم غیر مسلم سب کے نزدیک شہرت حاصل ہے اس کا ہر طبقے میں تواتر اس قدر مشہور ہے کہ کوئی خاص سلسلہ سند پیش کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔

۳-تواترِ تعامل، جسے تواترِ توارث بھی کہہ سکتے ہیں، کسی عمل پر عہد رسالت سے اب تک جماعتِ کثیرہ کا تواتر چلا آتا ہو اور عادۃً ان کا غلط بات پر متفق ہونا محال نظر آئے جیسا کہ نمازِ پنجگانہ کا تواتر ہے۔ اسی طرح وضو سے پہلے مسواک کا مسئلہ ہے مسواک اگرچہ سنت ہے مگر اس کی سنت کا اعتقاد رکھنا فرض ہے اس لئے کہ یہ تواترِ عمل سے ثابت ہے علماء نے کہا ہے حدیث لَاوَصِيَّةَ لِـــوَارِثٍ (وارث کے حق میں وصیت نہیں ہوسکتی) کو بھی تواتر

---

[1] نووی شرح صحیح مسلم، ص ۸۔

تعامل حاصل ہے کیونکہ اس پر عمل انتہائی ظہور کو پہنچ چکا ہے۔ اولیاء صالحین کی زیارت کے مقصد سے سفر کرنا بھی اس ضمن میں داخل ہے کیونکہ ہر دور میں اس پر جماعتِ کثیرہ کا عمل رہا ہے۔

۴۔ تواترِ معنوی، جسے تواترِ قدرِ مشترک بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ مختلف اخبار آحاد کے ملانے سے ایک ایسی قدرِ مشترک حاصل ہو جو درجۂ تواتر کو پہنچ جائے۔

علامہ نورالدین حاشیۂ مقدمہ ابن صلاح میں اس کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَمُتَوَاتِرٌ مَعْنَوِيٌّ وَهُوَ اَنْ يَنْقُلَ جَمَاعَةٌ يَسْتَحِيْلُ تَوَاطُؤُهُمْ عَلَى الْكِذْبِ وَقَائِعَ مُخْتَلِفَةً تَشْتَرِكُ فِيْ اَمْرٍ مُعَيَّنٍ فَيَكُوْنُ هٰذَا الْاَمْرُ مُتَوَاتِرًا۔[1]

"متواترِ معنوی وہ ہے جسے ایک ایسی جماعت نقل کرے جن کا جھوٹ پر متفق ہونا عادۃً محال ہو، روایت کردہ واقعات مختلف ہوں لیکن ان سے قدرِ مشترک حاصل ہو جو امر متواتر ہو"۔

جیسا کہ حاتم کی سخاوت کے واقعات ہیں جو روایاتِ آحاد ہیں البتہ ان سے جودِ حاتم کا معنیٰ حاصل ہوتا ہے، وہ متواتر ہے، حضور رحمتِ دو عالم ﷺ کے معجزات بھی متواترۃ المعنیٰ ہیں۔

---

[1] حاشیہ مقدمہ ابن صلاح، ص ۲۳۲۔

متواتر کے بعد خبر مشہور کی تشریح پیش کی جاتی ہے۔

خبر مشہور

امام فخر الاسلام بزدوی خبر مشہور کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اَلْمَشْهُوْرُ مَا كَانَ مِنَ الْاٰحَادِ فِي الْاَصْلِ ثُمَّ انْتَشَرَ فَصَارَ يَنْقُلُهُ قَوْمٌ لَا يُتَوَهَّمُ تَوَاطُؤُهُمْ عَلَى الْكِذْبِ وَهُمُ الْقَرْنُ الثَّانِيْ بَعْدَ الصَّحَابَةِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَمَنْ، بَعْدَهُمْ۔ [1]

"حدیث مشہور وہ ہے جو اصل میں اخبار آحاد سے ہو بعد میں اس کی شہرت ہو گئی ہو اور اسے صحابہ کے بعد قرنِ ثانی اور بعد کے لوگوں نے اس قدر کثرت سے روایت کیا ہو جن کا جھوٹ پر متفق ہونا محال ہو"۔

گویا طبقہ صحابہ میں تو وہ خبر واحد ہے اور بعد میں وہ متواتر کی شکل اختیار کر لیتی ہے اسی بنا پر اسے متواتر سے کم درجہ دیا جاتا ہے، فخر الاسلام نے عیسیٰ بن ابان سے نقل کیا ہے کہ اس کا منکر گمراہ ہے، کافر نہیں، [2] یہ علمِ یقین کا فائدہ نہیں دیتی بلکہ اس سے علمِ طمانیت [3] حاصل ہوتا ہے۔

علامہ تفتازانی طمانیت کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس سے مراد علم ظنی کا قرائن سے قریب بہ یقین ہو جانا ہے، [4] طمانیت سے نفس کو سکون حاصل ہوتا ہے اور شبہات کا ازالہ ہو جاتا ہے تاہم یہ علم یقینی نہیں

---

[1] اصول بزدوی، ص ۱۵۲۔ [2] ایضاً ص ۱۵۲۔ [3] ایضاً، ص ۱۵۲۔ [4] تلویح، ص ۲۲۳۔

کہلاتا۔ علمائے اصول فرماتے ہیں کہ خبر مشہور سے کتاب اللہ کے حکم پر زیادتی ہو سکتی ہے جسے اصطلاحی طور پر بھی نسخ کہہ سکتے ہیں مثلاً قرآن سے وضو میں پاؤں کا دھونا ثابت ہے، حدیث مشہور سے موزوں پر مسح کرنا ثابت ہے اور وہ ثابت العمل ہے،[1] اسی طرح قرآن سے زانی کیلئے سو کوڑوں کی سزا ثابت ہے، احادیث مشہورہ سے رجم کا حکم ثابت ہوتا ہے[2] وغیرہ۔

خبر مشہور کے بعد خبر واحد کی بحث شروع کی جاتی ہے، چونکہ خبر واحد کی حجیت متنازعہ فیہ ہے اس لئے اس پر تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔

خبر واحد کی تفصیلی بحث

ہم اس بحث کو چند حصوں میں تقسیم کریں گے:

۱-خبر واحد کا مفہوم اور حکم
۲-خبر واحد کے مقبول ہونے کے شرائط
۳-خبر واحد کے واجب الاتباع ہونے کے دلائل
۴-ظن کی لغوی و اصطلاحی تحقیق

خبر واحد کا مفہوم

کچھ حضرات نے خبر واحد کو عام سنت کے مقابلے میں ایک استثنائی صورت قرار دے کر اس کی اہمیت کم کرنے کی کوشش کی ہے اور پھر اکابر

---

[1] الحسامی، ص ۷۰۔

[2] اصول بزدوی، ص ۱۵۲۔

احناف کو بھی اس غلط تصور میں اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی ہے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ علماء اصول کے نزدیک خبر واحد کا جو سیدھا سادہ مفہوم ہے اسے واضح کر دیا جائے، امام فخر الاسلام بزدوی فرماتے ہیں:

هُوَ كُلُّ خَبَرٍ يَرْوِيْهِ الْوَاحِد اَوِالْاِثْنَانِ فَصَاعِدًا لَاعِبْرَةَ لِلْعَدَدِ فِيْهِ بَعْدَ اَنْ يَكُوْنَ دُوْنَ الْمَشْهُوْرِ وَالْمُتَوَاتِرِ وَهٰذَا يُوْجِبُ الْعَمَلَ وَلَايُوْجِبُ الْعِلْمَ يَقِيْنًا عِنْدَنَا۔[1]

”ہر وہ خبر جسے ایک یا دو یا اس سے زائد راوی روایت کریں جو مشہور اور متواتر سے کم درجے کے ہوں، اس سے عمل واجب ہوتا ہے، ہمارے نزدیک علم یقینی حاصل نہیں ہوتا“۔

یعنی خبر واحد کے راوی مشہور اور متواتر سے کم ہوتے ہیں یہ واجب العمل ہے بشرطیکہ شرائط موجود ہوں۔

خبر واحد کے واجب الاتباع ہونے کے شرائط

علمائے کرام نے خبر واحد کے واجب الاتباع ہونے کے لئے حسب ذیل آٹھ شرطیں مقرر کی ہیں جن پر غور کرنے کے بعد عقل سلیم کو تردد نہیں رہتا کہ خبر واحد پر ضرور عمل کرنا چاہیے۔ ان آٹھ شرائط میں سے چار کا تعلق راوی سے ہے اور چار کا متن حدیث سے۔ راوی میں عقل، عدالت،

---

[1] اصول بزدوی، ص ۱۵۲۔

اسلام اور ضبط کا پایا جانا ضروری ہے۔[1]

متن حدیث کیلئے بھی یہ چار شرائط ضروری ہیں۔

۱- لَایَکُوْنُ مُخَالِفًا لِلْکِتَابِ. کتاب اللہ کے خلاف نہ ہو، اگر کوئی ایسی خبر واحد ہو جو کسی آیت کے خلاف ہو تو دیکھیں گے، کسی طرح تطبیق ممکن ہے یا نہ؟ اگر تطبیق ہو تو تطبیق دیں گے ورنہ خبر واحد بالاتفاق متروک اور ناقابل عمل ہوگی۔

۲- لَایَکُوْنَ مُخَالِفًا لِلسُّنَّةِ الْمَشْهُوْرَةِ (خبر واحد کسی خبر مشہور ومتواتر کے خلاف نہ ہو) اگر خبر واحد حدیث متواتر ومشہور کے خلاف ہو اور کسی طرح تطبیق ممکن ہو تو تطبیق دیں گے ورنہ خبر واحد کو چھوڑ دیں گے۔ مثلاً حدیث قَضٰی بِشَاهِدٍ وَّيَمِيْنٍ خبر واحد ہے اس کا مقتضٰی یہ ہے کہ اگر مدعی کے پاس ایک ہی گواہ ہو اور مدعی قسم اٹھانے کو تیار ہو تو اس سے قسم لے کر فیصلہ اس کے حق میں کر دیا جائے اس کے مقابلے میں حدیث مشہور ہے اَلْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِیْ وَالْيَمِيْنُ عَلٰی مَنْ اَنْكَرَ یعنی مدعی کے ذمہ گواہ ہیں اور قسم اٹھانا مدعا علیہ کا کام ہے، اس لئے یہاں پر کچھ حضرات نے خبر واحد کو حدیث مشہور کے مقابلے میں متروک قرار دیا ہے، امام طحاوی نے اس کی تاویل یہ کی ہے کہ قَضٰی بِالشَّاهِدِ مَعَ الْيَمِيْنِ میں ایک

---

[1] الحسامی ص ۷۱۔

احتمال یہ بھی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فیصلہ شاہد و یمین کے ساتھ کیا یعنی مدعی کے گواہ لئے اور مدعا علیہ سے قسم لی، اس صورت میں خبر واحد خبر مشہور کے مطابق ہو جاتی ہے۔[1] وَاللّٰهُ اَعْلَمُ۔

۳- اَنْ لَّا یَکُوْنَ فِیْ حَادِثَةٍ تَعُمُّ بِهَا الْبَلْوٰی، تیسری شرط یہ ہے کہ خبر واحد ایسے مسائل سے متعلق نہ ہو جن کا وقوع عام ہوتا ہے اور جنہیں عموماً ہر شخص جانتا ہے، اگر خبر واحد میں ایسا حکم ہو جس کا تعلق عام لوگوں سے تھا تو وہ خبر متروک ہوگی اس لئے کہ عامۃ الناس سے اس کا تعلق ہونا اس امر کا مقتضی ہے کہ وہ حدیث درجہ شہرت کو پہنچی ہو اگر ایسا نہیں تو ہم سمجھیں گے کہ یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے اس لئے اس کا جاننا ضروری نہیں سمجھا، یا یہ کہ راوی کو غلط فہمی ہو گئی یہی وجہ ہے کہ قرأت وغیرہ کے بارے میں اخبار آحاد قبول نہیں کی جاتیں اس لئے کہ ان کا تعلق جمہور مسلمین سے تھا لہٰذا وہاں اخبارِ متواترہ ہونی چاہیں۔

۴- اَنْ لَّا یَکُوْنَ مَتْرُوْکَ الْمُحَاجَّةِ عِنْدَ ظُهُوْرِ الْاِخْتِلَافِ. چوتھی شرط یہ ہے کہ ظہور اختلاف کے وقت اس سے استدلال واحتجاج متروک نہ ہو چنانچہ اگر کسی وقت صحابہ کا اس میں اختلاف ہوا لیکن انہوں نے اس روایت کو بطور دلیل پیش نہ کیا تو اس سے ثابت ہوگا کہ وہ حدیث واجب الاتباع نہیں، صحابہ کا اس سے اغماض اس کے منسوخ ہونے

---

[1] شرح معانی الآثار طحاوی، ج ۲: ص ۳۷۹۔

کی علامت سمجھا جائے گا۔[1]

خبر واحد کا حکم

ظاہر ہے جب حدیث خبر واحد ہونے کی صورت میں ان تمام اوصاف وشرائط کی حامل ہو تو اس کے واجب الاتباع ہونے سے کوئی سلیم العقل انسان انکار نہیں کر سکتا، ان شرائط کے موجود ہونے کی صورت میں جمہور علماء کے نزدیک خبر واحد مفیدِ ظن ہوگی نہ کہ مفیدِ یقین، اس پر عمل کرنا ضروری ہے لیکن اس سے علم یقینی حاصل نہیں ہوتا، علامہ بہاری فرماتے ہیں:

يَجِبُ الْعَمَلُ بِخَبَرِ الْوَاحِدِ اِجْمَاعًا.[2]

”خبر واحد پر عمل کرنا اجماعا واجب ہوتا ہے“۔

فخر الاسلام بزدوی نے ظن کے بجائے غالب الرای کا لفظ استعمال کیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

فَكَذٰلِكَ هٰذَا الْخَبَرُ مِنَ الْعَدْلِ يُفِيْدُ عِلْمًا بِغَالِبِ الرَّأْيِ وَذٰلِكَ كَافٍ لِلْعَمَلِ.[3]

”اسی طرح خبر واحد عادل کی غالب رائے کا فائدہ دیتی ہے اور عمل کے لئے اتنا علم کافی ہے“۔

اکثر حضرات نے علم ظنی کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن یہاں پر ظن کے

---

[1] الحسامی، ص ۷۰، تسہیل الوصول، ص ۱۵۰۔ [2] مسلم الثبوت مع الشرح ص ۲۴۲۔ [3] اصول بزدوی، ص ۱۲۸۔

معنٰی وہم وگمان کے نہیں جیسا کہ بعض حضرات کو وہم ہوا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں لفظِ ظن کی لغوی واصطلاحی تحقیق بیان کر دی جائے تا کہ کسی قسم کا شبہ باقی نہ رہے۔

لفظ ظن کی تحقیق

لغتِ عرب میں لفظِ ظن مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے، علامہ مرتضٰی زبیدی فرماتے ہیں:

وَقَدْ وَرَدَ الظَّنُّ فِی الْقُرْاٰنِ مُجْمَلاً عَلٰی اَرْبَعَةِ اَوْجُهٍ بِمَعْنَی الْیَقِیْنِ وَبِمَعْنَی الشَّکِّ وَبِمَعْنَی التُّهْمَةِ وَبِمَعْنَی الْحِسْبَانِ ثُمَّ ذَکَرَ الْاٰیَاتِ قَالَ شَیْخُنَا رَحِمَهُ اللّٰهُ وَحَرَّرَمُحْشُوًّا الْبَیْضَاوِیْ وَالْمُطَوَّلِ اَنَّ الظَّنَّ لَایُسْتَعْمَلُ بِمَعْنَی الْیَقِیْنِ وَالْعِلْمِ فِیْمَا یَکُوْنُ مَحْسُوْسًا وَجَزَمَ اَقْوَامٌ بِاَنَّهٗ مِنَ الْاَضْدَادِ کَمَا فِیْ شَرْحِ الْفَصِیْحِ[1]

اس عبارت سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآنِ مجید میں ظن چار معانی میں استعمال ہوا ہے:

۱-یقین ۲-تہمت ۳-شک ۴-وہم وگمان

ہر ایک مقام پر قرائن کے مطابق معنٰی مراد لیا جائے گا لہٰذا بطور

---

[1] تاج العروس شرح قاموس، ج۹: ص۲۷۲۔

کلیہ، وہم وگمان مراد لینا غلط ٹھہرا۔ مفرداتِ قرآنیہ کے ماہر علامہ راغب اصفہانی فرماتے ہیں:

اَلظَّنُّ اِسْمٌ لِمَایَحْصُلُ عَنْ اِمَارَۃٍ وَمَتٰی قَوِیَتْ اَدَّتْ اِلَی الْعِلْمِ وَمَتٰی ضَعُفَتْ جِدًّا لَمْ یَتَجَاوَزِ التَّوَھُّمَ وَمَتٰی قَوِیَ اَوْ تَصَوَّرَ تَصَوُّرَ الْقَوِیِّ اُسْتُعْمِلَ مَعَ اَنَّ الْمُشَدَّدَۃِ الْمَفْتُوْحَۃِ وَاَنِ الْمُخَفَّفَۃِ وَمَتٰی ضَعُفَ اُسْتُعْمِلَ اَنَّ اَنِ الْمُخَفَّفَۃَ بِالْمَعْدُوْمَیْنِ مِنَ الْقَوْلِ وَالْفِعْلِ فَقَوْلُہٗ اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلَاقُوْا رَبِّھِمْ وَکَذَا یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلَاقُوا اللّٰہِ فَمِنَ الْیَقِیْنِ۔[1]

امام اصفہانی کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ ظن وہ ہے جو امارات سے حاصل ہوتا ہے بعض اوقات یہ قوی ہو کر درجہ علم ویقین کو پہنچ جاتا ہے اور بعض اوقات ضعیف ہو کر توہم کی صورت اختیار کر لیتا ہے اس کے بعد آپ نے ایک قاعدہ بیان کیا ہے کہ اگر ظن حقیقۃً قوی ہو یا اسے کسی مصلحت کی بنا پر قوی فرض کیا گیا ہو تو وہاں ظن کیساتھ اَنَّ مشددۃ یا مخففہ مفتوحہ استعمال ہوتا ہے اور اگر ظن ضعیف ہو تو اِن مشددہ یا مخففہ مکسورہ استعمال کیا جاتا ہے۔

علامہ ابن منظور افریقی لسان العرب میں لفظ ظن کی تحقیق کرتے ہوئے ایک نکتے کی بات کہتے ہیں لکھتے ہیں:

اَلظَّنُّ شَکٌّ وَیَقِیْنٌ اِلَّا اَنَّہٗ لَیْسَ بِیَقِیْنِ عِیَانٍ اِنَّمَا ھُوَ

---

[1] مفردات امام راغب، ص ۳۱۹۔

يَقِيْنُ تَدَبُّرٍ فَاَمَّا يَقِيْنُ الْعَيَانِ فَلَا يُقَالُ فِيْهِ اِلَّا الْعِلْمُ۔[1]

''ظن کا لفظ شک اور یقین دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن یقین عیانی کے لئے نہیں بلکہ یقین نظری کے لئے جہاں تک یقین عیانی کا تعلق ہے اس کیلئے علم کا لفظ استعمال ہوتا ہے''۔

اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ ظن سے علم نظری استدلالی بھی حاصل ہوتا ہے۔

آیئے اب ان آیاتِ قرآنیہ پر غور کریں جن میں اتباعِ ظن کی مذمت کی گئی ہے اور جن کو آڑ بنا کر منکرین حدیث اخبارِ آحاد کی حجیت کا انکار کرتے ہیں:

۱۔ سورۂ نجم میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا. (سورۂ النجم، ایت ۲۸)

''ان کے پاس علم نہیں، صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں اور ظن حق کی جگہ کچھ کارآمد نہیں ہوتا''۔

۲۔ سورۃ النساء میں فرمایا گیا ہے:

وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ

---

[1] لسان العرب، ۱۳: ص ۲۷۲۔

اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ. (سورۃ النساء، ایت ۱۵۸)

"جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملے میں اختلاف کرتے ہیں وہ شک میں پڑے ہوئے ہیں اُن کو اس کا کچھ علم نہیں، صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں"۔

۳-سورۃ الحجرات میں ارشاد ہوتا ہے:

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ. (سورۃ الحجرات، ایت ۱۲)

"اے ایمان والو! بہت گمان کرنے سے بچو! کیونکہ بعض گمان گناہ کی حد تک پہنچے ہوئے ہیں"۔

۴-سورۃ الانعام میں فرمایا گیا ہے:

قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ٥ (سورۃ الانعام، ایت ۱۴۸)

"فرمادیجئے تمہارے پاس اس بات کا کوئی علمی ثبوت ہو تو ہمیں دکھاؤ تم تو نری اٹکل پر چلتے ہو اور صرف تخمینے ہی کرتے ہو"۔

غور کیجیے! ان تمام آیات میں ظن سے مراد بے سر و پا بات ہے جو انسان محض اٹکل سے کہے اور جس کا کوئی علمی ثبوت نہ ہو چنانچہ پہلی آیت میں علم اور ظن کو مقابل قرار دیا گیا ہے اور ان لوگوں کے غلط ظن کی مذمت کی

گئی ہے جو ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں (معاذ اللہ) دوسری آیت میں ان لوگوں کا حال بیان کیا گیا ہے جو مسیح علیہ السلام کے بارے میں محض شک وگمان کے اندھیروں میں پڑے ہوئے ہیں۔ تیسری آیت میں ظن ووہم سے اجتناب کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور کسی بھی مسلمان کے خلاف بد گمانی کرنے کو گناہ قرار دیا گیا ہے۔ چوتھی آیت میں مشرکین اور اُن کے آباؤ اجداد کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان کے پاس مزعومات باطلہ کے اثبات کے لئے کوئی علمی ثبوت نہیں، صرف وہم وگمان کی پیروی کرتے ہیں۔

غرضیکہ اس قسم کی تمام آیات میں جہاں ظن کی مذمت کی گئی ہے وہ ظن ہرگز مراد نہیں جو اَدلہ شرعیہ سے حاصل ہوتا ہے بلکہ اپنی جانب سے بنائے ہوئے بے بنیاد خیالات کو ظن کہا گیا ہے اور اسی کی مذمت کی گئی ہے، ان تمام آیات میں ظن سے مراد وہ اوہام وخیالات ہیں جو اسلامی عقائد کے برخلاف ہیں۔ اس ظن یا غالب رائے کی تردید کا ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ملتا جو خبر واحد سے حاصل ہوتا ہے لہٰذا ان آیات کو خبر واحد کی حجیت کے خلاف دلیل بنانا کسی صاحب فہم کو زیب نہیں دیتا۔

اب ہم خبر واحد کے حجت اور موجب عمل ہونے پر کتاب وسنت وغیرہ سے دلائل پیش کریں گے۔

دلائل حجیتِ خبر واحد

۱- قرآن کریم کا ارشاد ہے:

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْآ اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ. (سورہ توبہ ۴)

"ایسا کیوں نہیں ہوا کہ ہر جماعت میں سے ایک طائفہ دین کی تعلیم کے لئے نکل کھڑا ہوتا تاکہ وہ جب لوٹ کر اپنی قوم کے پاس جاتا تو اُن کو ڈراتا، شاید وہ بھی بری باتوں سے بچنے لگتے"۔

لغت میں طائفہ کسی چیز کے ایک حصہ کو کہتے ہیں اس لئے اس کا اطلاق ایک شخص سے لے کر جماعت تک کیا جا سکتا ہے لہٰذا آیت بالا کے بموجب ہر جماعت کا فرض ہے کہ اس کے پاس کوئی فرد یا طائفہ دین کی باتیں پہنچائے تو وہ انہیں صحیح تسلیم کرے اور قبول کر لے۔

۲- قرآنِ کریم میں بے شمار مقامات پر اس کا ذکر ہے کہ مختلف قوموں کی طرف ایک ایک رسول یا نبی کو بھیجا گیا۔ اس ذات واحد کی خبر کو پوری اُمت کیلئے حجت قرار دیا گیا اور اس کی خبر کو صحیح تسلیم نہ کرنے والوں کو مستحق عذاب قرار دیا گیا، اگر خبر واحد حجت نہ ہوتی تو چاہئے تھا کہ ایک فرد کو رسول بنا کر نہ بھیجا جاتا بلکہ پوری جماعت کو ایک اُمت کی طرف مبعوث کیا جاتا۔

۳- انبیاءِ کرام کی خبر واحد تو عظیم مقام رکھتی ہے، قرآنِ مجید سے غیر نبی کی خبر واحد کو تسلیم کرنے کا تاریخی ثبوت بھی ملتا ہے چنانچہ سورۂ قصص میں ارشاد ہوتا ہے:

وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَی الْمَدِیْنَةِ یَسْعٰی قَالَ یٰمُوْسٰٓی اِنَّ الْمَلَاَ یَاْتَمِرُوْنَ بِکَ لِیَقْتُلُوْکَ فَاخْرُجْ اِنِّیْ لَکَ مِنَ النّٰصِحِیْنَo فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ. (سورۃ القصص ایت ۲۰، ۲۱)

''شہر کے سرے سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا، کہا اے موسیٰ! درباروالے مشورہ کرتے ہیں کہ تمہیں مار ڈالیں تم نکل جاؤ، یقیناً میں تمہارا خیرخواہ ہوں تو وہ وہاں سے ڈرتے اور انتظار کرتے نکل گئے''۔

ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو خبر دینے والا ایک عام آدمی ہے، موسیٰ علیہ السلام نے اس کی خبر مان لی جو بلاشبہ ایک فرد کی روایت تھی، جماعت کی نہ تھی اور اس سے اثر بھی لیا، پس شخص واحد روایت کرے جو پیغمبر نہیں اور پیغمبر اس روایت کو قبول کر کے اثر لے یعنی غیر نبی کی روایت کو مان لے تو کیا اس سے بڑھ کر بھی خبر فرد کے ثبوت اور اس کی حجیت کے معتبر ہونے کا ثبوت ہوسکتا ہے۔

۴- قرآنِ مجید میں خبر اور شہادت دونوں کے معاملے میں مخبر اور شاہد کی عدالت کو اہمیت دی گئی ہے، کثرتِ تعداد پر زور نہیں دیا گیا چنانچہ

سوائے حدِ زنا کے قصاص، شراب، خمر اور سرقہ وغیرہ حدود کے بارے میں صرف دو آدمیوں کی شہادت کو کافی سمجھا گیا حالانکہ ظاہر ہے کہ دو آدمیوں کی شہادت قطعاً حدِ تواتر کو نہیں پہنچتی، معلوم ہوا کہ اسلام میں اخبارِ آحاد بھی حجت ہیں ورنہ قصاص جیسے اہم معاملے میں تو کم از کم تواتر ضروری قرار دیا جاتا۔

۵- قرآنِ کریم میں فاسق کی خبر کو بھی مطلقاً رد نہیں کیا گیا بلکہ اس بارے میں ارشاد فرمایا گیا:

يَـاَيُّهَا الَّـذِيْـنَ اٰمَـنُوْا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ بِـنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ. (حجرات ۶)

"اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لائے تو تحقیق کر لیا کرو ایسا نہ ہو کہ نادانستگی میں تم کسی قوم پر مصیبت ڈھاؤ اور پھر اپنے کیے پر پچھتاؤ"۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ شخصِ واحد کی خبر اس کے فاسق ہونے کے باوجود بھی معتبر اور حجت ہونے کی شان رکھتی ہے بشرطیکہ تحقیق میں آجائے اور حجت بھی ایسے اہم معاملات میں جن کے بگڑ جانے کی صورت میں اجتماعی طور پر ندامت اٹھانی پڑے اگر فاسق کی خبر مطلقاً ناقابلِ اعتبار ہوتی تو یوں فرمایا جاتا کہ فاسق کوئی خبر لائے تو ہرگز اس کی بات کا اعتبار نہ کرو نہ یہ کہ تحقیق کے بعد اسے مان لو اور معتبر سمجھو، بہرحال تحقیق کے بعد وہ خبرِ واحد ہی

رہے گی لہذا جب فاسق کی خبر بھی تحقیق کے بعد قابل اعتبار بن جاتی ہے تو راوی عادل اور متقی و متدین کی خبر کیوں قابل اعتبار قرار نہ دی جائے۔

ظاہر ہے انبیاء کرام اور علماء کی بلاواسطہ خبر کو معتبر ماننے کے لئے قطعاً تبین اور تحقیق کی ضرورت نہیں رہے گی لیکن اگر وسائط سند کی وجہ سے اس پر بھی تحقیق و تبین کر لیا جائے تو پھر یہ خبر بدرجہ اولیٰ واجب الاعتبار بن جائے گی مگر بہر صورت خبر واحد ہی رہے گی۔

اس تقریر سے خبر واحد کی حجیت از روئے قرآن روشن ہو گئی۔

کتاب اللہ کے علاوہ سنت رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف رجوع کرنے سے بھی یہ حقیقت ثابت ہو جاتی ہے کہ عہد رسالت ہی سے مسلمان خبر واحد کو موجب عمل قرار دیتے چلے آئے ہیں اور انہوں نے کبھی یہ کہہ کر خبر واحد کو رد نہیں کیا کہ یہ چونکہ مفید یقین نہیں اس لئے ہم اس پر عمل نہیں کرتے جیسا کہ موجودہ دور کے نام نہاد محققین کا ادعا ہے۔

عہد رسالت کے چند واقعات

تحویل قبلہ سے قبل مسلمان بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے جب مدینہ منورہ میں تحویل قبلہ کی آیت اتری تو دوسرے دن صبح کو رسول اکرم ﷺ کا قاصد تحویل قبلہ کی خبر لے کر بستی قبا میں پہنچا، اس وقت اہل قبا صبح کی نماز پڑھ رہے تھے، جونہی انہوں نے تحویل قبلہ کی خبر سنی

نماز ہی میں اپنا رخ خانہ کعبہ کی طرف پھیر دیا۔[1]

اس سے صاف طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے ان کے نزدیک دینی مسائل میں خبر واحد حجت تھی اور اگر بالفرض ان کا یہ اقدام غلط ہوتا تو یقیناً آنحضرت ﷺ ان کو تنبیہ فرما دیتے کہ تم نے خبر واحد پر کیوں عمل کیا، براہ راست میری ہدایت یا خبر متواتر کا انتظار کیوں نہیں کیا مگر یہاں اعتراض تو در کنار اپنی طرف سے فرد واحد کا بھیجنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ خود صاحبِ نبوت علیہ السلام کے نزدیک بھی ایک عادل اور ثقہ آدمی کی روایت حجت تھی۔

۲۔ حضرت انس بن مالک ؓ کی یہ روایت بہت شہرت رکھتی ہے، آپ نے فرمایا کہ میں حرمتِ خمر سے پہلے ابو عبیدہ، ابو طلحہ اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہم کو شراب پلا رہا تھا، دفعۃً ایک منادی کی آواز کانوں میں پہنچی کہ شراب حرام کر دی گئی ہے۔ یہ سن کر حضرتِ ابو طلحہ نے جو شراب کے مٹکوں کے مالک تھے حکم دیا کہ انس اٹھو اور یہ مٹکے توڑ ڈالو میں نے اٹھ کر شراب کے مٹکے توڑ دیئے۔[2]

یہاں پر بھی خبر واحد پر ہی عمل کیا گیا اور تحریم خمر جیسے اہم مسئلے میں خبر واحد کو کافی سمجھا گیا کسی نے یہ نہ کہا کہ جب تک خبر متواتر نہ ہو یا براہِ راست، رسولِ اکرم ﷺ سے تحریم خمر کی تصدیق نہ کر لی جائے ہم یقین نہیں

---

[1] صحیح بخاری کتاب اخبار الآحاد، ۲: ص ۱۰۷۶۔ [2] الرسالۃ ص ۳۰۹۔ صحیح بخاری، ۲: ص ۱۰۷۷۔

کریں گے سب نے خبر واحد پر عمل کرتے ہوئے خبر واحد کی حجیت پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

۳-آنحضرت ﷺ نے زنا کے ایک مقدمے میں زانی کو اعتراف جرم پر کوڑے لگائے اور جس عورت کیساتھ اس نے زنا کرنے کا اعتراف کیا تھا اس کی طرف حضرت انیس کو بھیجا اور اسے فرمایا اِنِ اعْتَرَفَتْ فَارْجُمْهَا[1] (اگر وہ اعتراف کرلے تو اسے سنگسار کر دینا)

یہاں پر بھی ایک فرد کو حد شرعی کے نفاذ کیلئے مقرر کیا گیا اور اس کی خبر کو معتبر قرار دیا گیا۔

۴-اسی طرح رسول اکرم ﷺ نے ۹ھ میں حضرت صدیق اکبر ؓ کو امیر حج بنا کر بھیجا اس موقع پر مختلف بلاد وامصار سے بکثرت حجاج آئے حضرت صدیق اکبر ؓ نے انہیں مناسک حج کی تعلیم دی اور رسول اکرم ﷺ کے ارشادات پہنچائے مگر کوئی یہ اعتراض نہ کرسکا کہ فرد واحد کی خبر دوسروں کے لئے کس طرح قابل عمل ہوسکتی ہے اور کسی کو اعتراض کرنے کی جرأت ہی کیا تھی جب کہ خود سرور کائنات ﷺ نے انہیں نائب بنا کر بھیجا تھا۔ اسی طرح اسی موقع پر حضرت مولا علی ؓ کو مکہ مکرمہ بھیجا کہ وہ عہد شکن کفار کے معاہدے کے ختم ہونے کا اعلان کر دیں نیز یہ اعلان بھی کر دیں کہ آئندہ

---

[1] صحیح مسلم، ج۲: ص۶۹۔

کوئی مشرک حج کرنے نہ آئے اور نہ ہی کوئی شخص عریانی یا بے وضو ہونے کی حالت میں طواف کرے وغیرہ۔ [1]

۵- حضور ﷺ نے جہاں جہاں اپنے عامل اور قاصد بھیجے، ان میں بھی عدد کا کوئی لحاظ نہیں کیا، چنانچہ قیس بن عاصم اور زہرقان بن بدر اور ابن نویرہ کو ان کے قبائل کی طرف ایک ایک کر کے بھیجا گیا۔ حضرت معاذ بن جبل ؓ کو یمن بھیجا کہ وہاں کے لوگوں کو فرائض خداوندی کی تعلیم دیں اور ان سے صدقاتِ واجبہ وصول کریں۔ اسی طرح مختلف سلاطین کی طرف ایک ایک قاصد بھیجنا بھی مروی ہے۔ [2]

یہ تمام واقعات اس امر کا کھلا ثبوت ہیں کہ رسولِ اکرم ﷺ کے نزدیک واحد عادل کی خبر معتبر تھی۔

خلفائے راشدین اور خبر واحد

خلفائے راشدین نے بھی خبر واحد کو معتبر قرار دیا، اس بارے میں کثیر واقعات ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت صدیق اکبر ؓ کا وراثت جدہ کے بارے میں مغیرہ بن شعبہ اور محمد بن مسلمہ کی خبر پر عمل کرنا، حضرت عمر ؓ کا مجوسیوں سے جزیہ لینے کے بارے میں عبدالرحمٰن بن عوف کی خبر واحد پر عمل کرنا، اسی طرح دیتِ جنین کے بارے میں فاروق اعظم ؓ کا حمل بن

---

[1] الکامل لابن اثیر، ج ۲: ص ۱۹۹۔

[2] صحیح بخاری، ۸: ص ۱۱۱۔

مالک کی خبر پر عمل پیرا ہونا، حضرت عثمان غنی ﷛ کا بنت مالک کی روایت کے مطابق عدت کا مسئلہ طے کرنا، حضرت علی ﷛ کا خبر واحد کے سلسلے میں حلف لے کر اعتبار فرمانا[1] وغیرہ۔

یہ تمام امور اس بات کی روشن دلیل ہیں کہ خلفائے راشدین خبر واحد کو حجتِ شرعیہ سمجھتے تھے۔

علمائے ملت کا اتفاق

ہر دور میں علمائے ملت نے خبر واحد کو حجت مانا اور اس پر عمل کیا۔

امام شافعی الرسالہ میں لکھتے ہیں:

وَفِیْ تَثْبِیْتِ خَبَرِ الْوَاحِدِ اَحَادِیْثُ یَکْفِیْ بَعْضُ هٰذَا مِنْهَا وَلَمْ یَزَلْ سَبِیْلُ سَلَفِنَا وَالْقُرُوْنِ مَنْ بَعْدَهُمْ اِلٰی مَنْ شَاهَدْنَا هٰذِهِ السَّبِیْلَ.[2]

''خبر واحد کی حجیت کو ثابت کرنے کیلئے احادیثِ کثیرہ میں سے چند ایک بطور نمونہ کافی ہیں۔ ہمارے سلف اور ان کے بعد مختلف قرون میں یہی عقیدہ رہا ہے سب بزرگوں نے یہی راہ اختیار کی ہے، سلف صالحین میں سے چند اکابر کے نام لیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ علمائے مدینہ منورہ میں سے مندرجہ ذیل اصحاب قابل ذکر ہیں''۔

---

[1] ''خلفاءِ راشدین کی نظر میں سنت کا مقام'' اس عنوان سے مذکورہ حوالے گزشتہ اوراق میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ [2] الرسالۃ (للشافعی) ص ۴۵۳۔

۱-محمد بن جبیر بن مطعم ۲-نافع بن جبیر بن مطعم
۳-یزید بن طلحہ بن رکانہ ۴-محمد بن طلحہ بن رکانہ
۵-نافع بن عجرہ ۶-ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن
۷-حمید بن عبدالرحمٰن ۸-طلحہ بن عبداللہ بن عوف
۹-مصعب بن سعد بن ابی وقاص ۱۰-ابراہیم بن عبدالرحمٰن بن عوف
۱۱-خارجہ بن زید بن ثابت ۱۲-عبدالرحمٰن بن کعب بن مالک
۱۳-عبداللہ بن ابی قتادہ ۱۴-سلیمان بن یسار
۱۵-عطاء بن یسار وغیرہم

محدثین مکہ میں سے یہ اصحاب قابل ذکر ہیں۔

۱-عطأ بن ابی رباح ۲-طاؤس ۳-مجاہد
۴-عکرمہ بن خالد ۵-ابن ابی عمار ۶-عبداللہ بن باباہ وغیرہ

محدثین کوفہ میں یہ اصحاب ہیں۔

۱-علقمہ ۲-عامر بن شرحبیل شعبی ۳-اسود بن یزید وغیرہ

محدثین بصرہ میں اہم اصحاب یہ ہیں۔

۱-عبدالرحمٰن بن غنم ۲-حسن بصری ۳-محمد بن سیرین وغیرہ

یہ سب حضرات خبر واحد کو حجت تسلیم کرتے ہیں اور ان کے بعد کے علماء بھی خبر واحد کی حجیت پر متفق ہیں ائمہ اربعہ اور ان کے مقلدین بھی خبر

واحد کو حجت شرعیہ سمجھنے پر متفق ہیں البتہ خوارج اور معتزلہ نے اس کی حجیت میں اختلاف کیا لیکن معتزلہ میں سے بھی رئیس معتزلہ ابو علی جبائی کا قول یہ ہے کہ خبر واحد اگر عزیز ہو جائے یعنی سلسلہ سند میں کسی جگہ دو سے کم راوی نہ ہوں تو وہ بھی صحیح قرار پائے گی۔ [1]

ہم نے یہاں خبر واحد کی تفصیلی بحث اس لئے چھیڑ دی تا کہ جو حضرات خبر واحد کو ظنی قرار دے کر یا سنت سے استثنائی صورت قرار دے کر اس کی اہمیت کو کم کرنا چاہتے ہیں اور یہ تأثر دینا چاہتے ہیں کہ اخبارِ آحاد کو شروع اسلام سے حجت نہیں سمجھا گیا ان کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے اور خبر واحد کی شرعی حیثیت کھل کر سامنے آجائے اہل انصاف کیلئے اتنا کچھ کافی ہے اور اہل تعصب کے لئے دفتر کے دفتر بے کار ہیں۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَامِنَ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ.

حرفِ اختتام

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مقالہ اختتام کو پہنچا، اس مقالے سے مقصود یہ ہے کہ مسلک اہل سنت و جماعت کے مطابق سنت وحدیث کے بارے میں اپنا موقف واضح کیا جائے، اب تک جمہور اہل اسلام کا سنت وحدیث کے بارے میں جو نظریہ رہا ہے اسے مستند کتابوں کے حوالے سے

---

[1] شرح نخبۃ الفکر، ص ۲۴۔

قارئین کرام کے سامنے پیش کیا جائے اور دور حاضر میں جن حضرات کو سنت وحدیث کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا ہوئے ہیں دیانتدارانہ انداز میں ان کا ازالہ کیا جائے۔

اس سے ہمارا مقصد تنقید برائے تنقید نہیں بلکہ اصلاح مقصود ہے، یہ دیکھ کر انتہائی افسوس ہوتا ہے کہ وہ اہل قلم حضرات جنہیں خدا نے کچھ لکھنے پڑھنے کی صلاحیت عطا کی ہے اور وہ اس صلاحیت سے فائدہ اٹھا کر دین کی خدمت کر سکتے ہیں اور مغربی اقوام کے سامنے اسلام کا پیغام مؤثر انداز میں پیش کر سکتے ہیں، بدقسمتی سے انہوں نے منفی اندازِ فکر اپنا لیا ہے وہ مستشرقین یورپ کے لٹریچر کے مطالعے سے اس قدر متاثر بلکہ مرعوب ہو گئے ہیں کہ وہ اب کتاب وسنت اور اسلامی روایات کا مطالعہ صرف اہل یورپ ہی کی عطا کردہ عینک سے کرنا چاہتے ہیں انہیں جو چیز بھی دانایانِ فرنگ کے فکر ونظر کے مطابق نظر نہیں آتی اس کی تاویل کرنا اور بسا اوقات صاف انکار کر دینا اپنا ”علمی فریضہ“ سمجھتے ہیں، انہیں اہل مغرب کے حملوں کے خلاف اسلامی روایات کا دفاع کرنا چاہیے تھا مگر بجائے دفاع کے وہ دشمن کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں اور اسے خود تیر چن چن کر دے رہے ہیں تا کہ وہ اسلام کے سینے کو زیادہ سے زیادہ چھلنی کر سکے۔

غنی روزِ سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخارا

جدید اہل قلم حضرات کے مقابلے میں ہمارے علمائے کرام کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار علمی صلاحیتوں سے نوازا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جہاں کفر و شرک کا ابطال کر سکتے ہیں وہاں عصر حاضر کے فتنوں کی بھی سر کوبی کر سکتے ہیں لیکن بعض مصلحتوں یا مجبوریوں کے پیش نظر تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ توجہ نہیں دے سکتے، وہ میدانِ خطابت کے شہسوار ہیں، تدریس میں انتہائی اونچا مقام رکھتے ہیں اور اپنی علمی صلاحیتوں کی بنا پر اہل سنت کے لئے سرمایہء افتخار ہیں۔

یہ ہیچمدان اس قابل نہیں کہ اہل علم حضرات کی صف میں کھڑا ہو سکے لیکن حتی المقدور خدمتِ دین کے لئے کوتاہی کرنے کو نامناسب خیال کرتا ہوں۔

میں نے تخصص فی التفسیر والحدیث کے ایک طالب علم کی حیثیت سے آج سے تقریباً گیارہ سال قبل جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں یہ مقالہ تحریر کیا تھا، اصل مقالہ تو جامعہ ہی میں ہے البتہ اس کا رف میرے پاس تھا جس میں ضروری ترمیم و اصلاح کے بعد اپنے مرشد کامل حضرت قبلہء عالم پیر سید مہر علی شاہ قدس سرہ العزیز کی طرف منسوب کرتے ہوئے اسے شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

---

[1] صحیح مسلم (کتاب الوصیۃ)، ج ۲: ص ۴۳۔

خدا کرے اس شیخ کامل کی پاکیزہ نسبت کی برکت سے یہ رسالہ بارگاہِ رسالت مآب میں قبولیت حاصل کرے اور اس گناہ گار کو آئندہ بھی سلف صالحین کے مسلک کی خدمت کرنے کی توفیق نصیب ہوتی رہے امین ۔ وَلَیْسَ ذٰلِکَ مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ بِبَعِیْدٍ.

احقر العباد مشتاق احمد چشتی عفی عنہ

مآخذ ومراجع

۱- الاحکام فی اصول الاحکام .... حافظ ابو محمد علی بن حزم (م۴۵۶ھ)
مطبع السعادۃ مصر

۲- ارشاد الساری الیٰ شرح البخاری ...... علامہ شہاب الدین احمد بن محمد الخطیب القسطلانی
(م۹۲۳ھ) مطبع کبریٰ امیریہ بولاق مصر ۱۳۲۳ھ

۳- ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء............ حضرت شاہ ولی اللہ احمد بن شاہ عبدالرحیم دہلوی
(م۱۱۷۶ھ) مطبع صدیقی بریلی

۴- الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب ...... حافظ ابو عمر یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبر
(م۴۶۳ھ) مطبع نہضہ مصر

۵- اسد الغابہ فی معرفۃ احوال الصحابہ...... شیخ ابوالحسن علی بن ابی الکرم محمد بن عبدالکریم المعروف
بابن الاثیر (م۶۳۰ھ) مطبع اسلامیہ تہران

۶- اشعۃ اللمعات .... شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م۱۰۵۲ھ)
مطبع منشی نولکشور لکھنؤ

۷- اصول الفقہ .... شیخ محمد بن عفیفی خضری (م۱۳۴۵ھ)
مطبع رحمانیہ مصر

۸- الاعتصام .... علامہ ابو اسحاق ابراہیم بن موسیٰ بن محمد الشاطبی
(م۷۹۰ھ) مطبع مصطفیٰ محمد مصر

۹- الاعلام .... خیرالدین زرکلی مطبع کوستاتھوماس (۱۹۵۴ء)

۱۰- اعلام الموقعین عن رب العالمین...... حافظ شمس الدین محمد بن ابی بکر المعروف بابن قیم
(م۷۵۱ھ)

ماخذ و مراجع

۱۱- انساب الاشراف .... شیخ احمد بن یحییٰ البلاذری (م ۲۷۷ھ)
دارالمعارف مصر

۱۲- البدایہ والنہایہ .... علامہ عماد الدین ابوالفدا اسمٰعیل بن عمر بن کثیر
دمشقی (م ۷۷۴ھ) مطبع السعادۃ مصر ۱۹۳۲ء

۱۳- تاج العروس .... سید ابوالفیض محمد بن محمد بن عبدالرزاق المعروف بہ
مرتضیٰ زبیدی (م ۱۲۰۵ھ) مطبع وہبیہ مصر

۱۴- تاریخ الامم والملوک .... امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری (م ۳۱۰ھ)
مطبع حسینیہ مصر

۱۵- تاریخ التشریع الاسلامی .... شیخ محمد بن عفیفی خضری (م ۱۳۴۵ھ)
مطبع استقامت قاہرہ ۱۹۶۱ء

۱۶- تاریخ الخلفاء .... علامہ جلال الدین عبدالرحمٰن سیوطی (م ۹۱۱ھ)
مطبع مجیدی کانپور اصح المطابع کراچی

۱۷- تذکرۃ الحفاظ .... حافظ شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن احمد ذہبی
(م ۷۴۸ھ) دائرۃ المعارف النظامیہ حیدرآباد

۱۸- الترغیب والترہیب .... حافظ زکی الدین عبدالعظیم المنذری (م ۶۵۶ھ)
مطبع مصطفیٰ البابی الحلبی مصر

۱۹- تسہیل الوصول الیٰ علم الاصول .... شیخ محمد عبدالرحمٰن المحلاوی (ولادت ۱۲۸۰ھ)
مکتبہ صدیقیہ ملتان

ماخذ و مراجع

۲۰-تفسیر ابن کثیر	.... حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر دمشقی (م۷۴۴ھ) مطبع عیسیٰ بابی حلبی مصر
۲۱-تفسیر الجامع لاحکام القرآن	.... امام ابو عبداللہ محمد احمد الانصاری القرطبی (م۶۷۱ھ) دار الکتب المصریہ
۲۲-تفسیر جامع البیان	.... امام ابو جعفر محمد بن جریر الطبری (۳۱۰ھ) مطبع میمنہ مصر
۲۳-تفسیر روح المعانی......	.... علامہ شہاب الدین سید محمود آلوسی بغدادی (م۱۲۷۰ھ) ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر
۲۴-تفسیر فتح العزیز	.... شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م۱۲۳۹ھ) مطبع محمدی لاہور
۲۵-تفسیر الکشاف	.... علامہ جار اللہ محمود بن عمر زمخشری (م۵۳۸ھ) مطبع استقامت بالقاہرہ
۲۶-تفسیر مفاتیح الغیب......	.... امام فخر الدین محمد بن عمر بن حسین الرازی (م۶۰۶ھ) مطبع بہیہ مصر
۲۷-تلخیص المستدرک......	.... حافظ شمس الدین محمد بن احمد الذہبی (م۷۴۸ھ) دائرہ معارف نظامیہ حیدر آباد
۲۸-تلویح شرح توضیح......	.... علامہ سعد الدین مسعود بن عمر التفتازانی (م۷۹۱ھ) نولکشور لکھنؤ

ماخذ و مراجع

۲۹- توضیح شرح التنقیح .... شیخ عبید اللہ بن مسعود بن محمود (م۷۴۸ھ)
نولکشور لکھنؤ

۳۰- تیسیر التحریر .... علامہ محمد امین مصری المعروف بہ امیر بادشاہ
(م۹۸۷ھ) مصطفٰی بابی حلبی مصر

۳۱- جامع بیان العلم .... حافظ ابو عمر یوسف بن عبد اللہ بن محمد بن عبد البر
(م۴۶۳ھ) ادارۃ الطباعۃ المنیریہ

۳۲- الجامع الصحیح للترمذی...... ...... امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی (م۲۷۹ھ)
مطبع مجیدی کانپورر کراچی

۳۳- الرسالۃ للشافعی...... ...... امام محمد ادریس الشافعی (م۲۰۴ھ)
مصطفٰی بابی حلبی مصر

۳۴- سنن ابی داؤد .... امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث سجستانی (م۲۷۵ھ)
مصطفٰی بابی حلبی مصر

۳۵- سنن ابن ماجہ .... امام ابو عبد اللہ بن محمد بن یزید بن ماجہ القزوینی
(م۲۷۳ھ) مطبع تازیہ مصر

۳۶- سنن نسائی .... امام ابو عبد الرحمٰن احمد بن شعیب النسائی (م۳۰۳ھ)
جید برقی پریس دہلی

۳۷- شرح مسلم للنووی...... ...... امام محی الدین یحییٰ بن شرف النووی (م۶۷۶ھ)
اصح المطابع کراچی

ماخذ و مراجع

۳۸- شرح مسلم الثبوت .... بحر العلوم مولانا عبد العلی لکھنوی (م ۱۲۲۵ھ)
نولکشور لکھنؤ

۳۹- شرح معانی الآثار ...... امام ابو جعفر احمد بن محمد الطحاوی (م ۳۲۱ھ)
مکتبہ آصفیہ دہلی ایضاً کراچی

۴۰- شرح نہج البلاغہ .... علامہ عبد الحمید بن ہبۃ اللہ بن ابی الحدید
(م ۶۵۶ھ) مصطفیٰ بابی حلبی مصر

۴۱- صحاح العربیہ .... شیخ ابو نصر اسمٰعیل بن حماد الجوہری (م ۳۹۳ھ)
مطبع دار الکتب

۴۲- الجامع الصحیح للامام البخاری ...... امام ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بخاری (م ۲۵۶ھ)
مطبع مصطفیٰ بابی حلبی مصر/ اصح المطابع کراچی

۴۳- الصحیح للامام مسلم ...... امام ابو الحسین مسلم بن الحجاج القشیری النیشاپوری
(م ۲۶۱ھ) اصح المطابع کراچی

۴۴- الطبقات الکبریٰ ...... علامہ محمد بن سعد الزہری المصری (م ۲۳۰ھ)
مطبع دار بیروت ۱۹۵۷ء

۴۵- عمدۃ القاری ...... شیخ بدر الدین ابو محمد محمد بن احمد العینی (م ۸۵۵ھ)
ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر

۴۶- عنایہ شرح ہدایہ برحاشیہ فتح القدیر...... شیخ اکمل الدین محمد بن محمود بابرتی حنفی (م ۷۸۶ھ)
مطبع مصطفیٰ محمد مصر

مآخذ و مراجع

۴۷- عون المعبود شرح سنن ابی داؤد ...... مولانا شرف الحق محمد اشرف عظیم آبادی، مطبع انصاری دہلی

۴۸- فتح الباری .... حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر العسقلانی (م۸۵۲ھ)

۴۹- فتح القدیر .... امام اکمل الدین محمد ابن ہمام (م۸۶۱ھ) مصطفیٰ محمد مصر

۵۰- الکامل فی التاریخ ...... عزالدین ابوالحسن علی بن ابی الکرم المعروف بابن الاثیر (م۶۳۰ھ) ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر

۵۱- کتاب الاصول سرخسی ...... امام ابوبکر محمد بن احمد بن ابی سہل السرخسی (م۴۸۳ھ) مطبوعہ حیدرآباد دکن

۵۲- کتاب الاصول بزدوی ...... علامہ فخر الاسلام علی بن محمد بزدوی (م۴۸۲ھ) مطبع نور محمد کراچی

۵۳- کتاب الام ...... امام محمد بن ادریس الشافعی (م۲۰۴ھ) مطبع کبریٰ امیریہ بولاق مصر

۵۴- تاریخ ابن خلدون ...... علامہ عبدالرحمٰن بن خلدون مغربی (م۸۰۸ھ) دارالکتاب لبنان

۵۵- کشف الاسرار .... شمس الائمہ عبدالعزیز بن احمد بن نصر بن صالح البخاری (۴۴۸ھ) مطبع شرکت صحافیہ عثمانیہ

مآخذ ومراجع

۵۶- کشف الغمہ عن جمیع الامہ ...... علامہ عبدالوہاب شعرانی (م۹۷۱ھ) مطبع میمنہ مصر

۵۷- کنز العمال .... علامہ علاؤالدین علی المتقی بن حسام الدین (م۹۷۵ھ) دائرہ معارف عثمانیہ حیدرآباد

۵۸- لسان العرب .... شیخ جمال الدین محمد بن مکرم المعروف بابن منظور افریقی (م۷۱۱ھ) دارالبیروت ۱۹۲۶ء

۵۹- لسان المیزان .... حافظ شیخ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی (م۸۵۲ھ) دائرہ معارف عثمانیہ حیدرآباد

۶۰- مجمع بحارالانوار .... شیخ محمد طاہر پٹنی (م۹۸۶ھ) نولکشور لکھنؤ

۶۱- مجمع الزوائد ومنبع الفوائد ...... حافظ نورالدین علی بن بکر ہیثمی (م۸۰۷ھ)

۶۲- محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ...... شیخ محمد خضری مصری (م۱۳۴۵ھ) مکتبہ تجاریہ کبریٰ ۱۳۶۶ء

۶۳- مستدرک علی الصحیحین...... امام ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ الحاکم النیشاپوری (م۴۰۵ھ) دائرہ معارف نظامیہ حیدرآباد

۶۴- المستصفی .... حجۃ الاسلام امام محمد الغزالی (م۵۰۵ھ) مطبع مصطفیٰ محمد مصر

۶۵- مسلم الثبوت .... علامہ محب اللہ بن عبدالشکور بہاری (۱۱۱۹ھ) مطبع انصاریہ دہلی

مآخذ و مراجع

۶۶-مسند احمد .... امام احمد بن محمد بن حنبل (م۲۴۱ھ) مطبع حیدریہ بمبئی

۶۷-مسند امام شافعی .... امام محمد بن ادریس شافعی (م۲۰۴ھ)
مکتبہ ثقافت اسلامیہ ۱۹۵۱ء

۶۸-مشکوٰۃ المصابیح .... شیخ ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب التبریزی
(م۷۴۹ھ)

۶۹-المفردات فی غریب القرآن ...... شیخ ابوالقاسم حسین بن محمد المعروف بہ راغب
اصفہانی (م۵۰۲ھ) مصطفیٰ بابی حلبی مصر

۷۰-مقدمہ ابن صلاح .... حافظ ابوعمرو عثمان بن عبدالرحمٰن شہرزوری
(م۶۴۳ھ)

۷۱-مناہل العرفان فی علوم القرآن ...... علامہ محمد عبدالعظیم زرقانی مطبع عیسیٰ بابی حلبی ۱۳۷۲ھ

۷۲-الموافقات .... علامہ ابواسحاق ابراہیم بن موسیٰ الشاطبی (م۷۹۰ھ)
مطبع مصطفیٰ محمد مصر

۷۳-الموضوعات الکبیر .... علامہ نورالدین علی بن سلطان محمد المعروف ملا علی قاری
(م۱۰۱۴ھ) اصح المطابع کراچی

۷۴-مؤطا امام مالک .... امام مالک بن انس (م۱۷۹ھ)
اصح المطابع کراچی

۷۵-میزان الاعتدال فی نقد الرجال ...... ابوعبداللہ شمس الدین محمد ذہبی (م۷۴۸ھ)
مطبع السعادۃ مصر

مآخذ ومراجع

۷۶-نزہۃ النظر شرح نخبۃ الفکر .... علامہ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی
(م۸۵۲ھ) مکتبہ علمیہ مدینہ منورہ

۷۷-نصب الرایہ فی...... الہدایہ...... علامہ جمال الدین عبداللہ بن یوسف زیلعی
(م۷۶۲ھ) مطبع دار المامون ۱۹۳۲ء

۷۸-النہایہ .... امام مجد الدین ابوالسعادات المبارک بن محمد بن محمد
الجزری (م۶۰۶ھ) مطبع خیریہ مصر

۷۹-الہدایہ .... شیخ الاسلام برہان الدین علی بن ابی بکر المرغینانی
(م۵۹۳ھ) مطبع مجتبائی دہلوی

۸۰-یسر الاسلام واصول التشریع العام.....علامہ سید محمد رشید رضا (م۱۳۴۵ھ)
مطبع نہضہ مصر

مکتبہ مہریہ کاظمیہ نیو ملتان سے طلب فرمائیں

- البیان فی ترجمۃ القرآن
- مقالات کاظمی تین جلد
- قدم الشیخ عبد القادر علی رقاب الاولیاء الاکابر
- درود تاج پر اعتراضات کے جوابات
- تسکین الخواطر
- معراج النبی
- فلسفہ نماز
- علم تفسیر اور مفسرین
- وقایۃ النحو شرح ہدایۃ النحو
- انوار المسائل
- انوار الافادات ترجمہ مقامات
- احسن التجوید
- احکام حلال و حرام
- تحفہ سعیدیہ شرح علم الصیغہ
- التبیان تفسیر پارہ اول
- خطبات کاظمی چار جلد
- انوار البیان
- الحق المبین
- میلاد النبی
- گستاخ رسول کی سزا قتل
- حدود آرڈیننس پر تبصرہ
- زبدۃ التوضیحات شرح سبع المعلقات
- انوار العقائد
- قرآنی قاعدہ
- علم التجوید
- عقیدہ ختم نبوت اور فتنہ قادیانیت
- قربانی کی شرعی حیثیت
- معین الابواب دو جلد